سہ ماہی

الاقرباء

اسلام آباد

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

سہ ماہی الاقرباء اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

جلد نمبر ۷ — شمارہ نمبر ۳ — جولائی۔ستمبر ۲۰۰۴ء

صدر نشین

سید منصور عاقل

مجلسِ ادارت

ناصر الدین — مدیر منتظم

شہلا احمد — مدیر مسئول

محمود اختر سعید — مدیر

مجلسِ مشاورت

پروفیسر ڈاکٹر محمد معز الدین

پروفیسر ڈاکٹر توصیف تبسم

ڈاکٹر عالیہ امام

معاونین خصوصی برائے یورپ و امریکہ

☆ بیرسٹر سلیم قریشی۔ برکلے چیمبر۔2۔اے، برکلے روڈ۔لیٹن سٹون (Leytonstone) لندن۔
ای 11، 3 ڈی جی، فون 5582289(0208) فیکس 5583849 (0208)

☆ اویس جعفری۔ 218 نارتھ ایسٹ 175 سٹریٹ سیٹیل (Seattle) واشنگٹن 98155
(یو۔ایس۔اے) فون 8094-361 (206) دفتر 5321-679 (360)
فیکس 0414-361 (206) ای میل jofreyomi@msn.com

الاقرباء فاؤنڈیشن۔اسلام آباد

مکان نمبر ۴۶۴ سٹریٹ نمبر ۵۸ آئی ۸/۳ اسلام آباد، فون ۴۴۴۲۶۸۶

E-mail: alaqrebaislamabad@hotmail.com

سہ ماہی الاقرباء اسلام آباد

شمارہ	جولائی۔ستمبر ۲۰۰۴ء
ناشر	سید ناصرالدین
کمپوزنگ	نعیم کمپوزرز۔اسلام آباد
طابع	ضیاء پرنٹرز۔اسلام آباد

زرتعاون

فی شمارہ	۵۰ روپے
سالانہ (مع محصول ڈاک)	۲۵۰ روپے
بیرون ملک فی شمارہ	۶ ڈالر/۴ پاؤنڈ
بیرون ملک سالانہ	۲۵ ڈالر/۱۵ پاؤنڈ

مندرجات

انشائیہ، خاکہ و افسانہ

حمد و نعت

غزلیات

رباعیات وقطعات

منظومات

نقد ونظر

مراسلات

خبرنامہ الاقرباء فاؤنڈیشن

اداریہ

مغرب میں اُردو زبان وادب کے امکانات

نواب مرزا داغ دہلوی اُردو نام کی جس زبان کو جانتے تھے اس کی دھوم ہندوستان میں مچی ہوئی تھی۔ یہ امران کیلئے یقیناً باعث فخر بھی تھا اور وجہ امتیاز بھی کہ "وہ ہی" اس زبان کو جاننے کا دعویٰ کر سکتے تھے یعنی

اُردو ہے جس کا نام ''ہمیں'' جانتے ہیں داغ

ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ داغ کی شاعری ان تمام جہتوں کی نقیب نظر آتی ہے جو سلاست وروانی، برجستگی وبے ساختگی، شوخی وشرارت اور معاملہ بندی ہی نہیں بلکہ خلوت وجلوت کے رموز ونکات، روزمرہ ومحاورہ کے نت نئے اسالیب اور معاشرتی وتہذیبی نزاکتوں اور باریکیوں کی جملہ لطافتوں کو احاطہ کئے ہوئے تھیں، یہ تمام اوصاف شاعر کی اُردو زبان پر تخلیقی گرفت اور ہمہ گیر تنوعاتی صلاحیت کے مرہون منت تھے جسے غالب، ذوق، مومن، انشاء، جرأت وآتش اور مصحفی ومیر جیسی عظیم ہستیوں کا پس منظر حاصل تھا جو اُردو زبان کے سفرِ ارتقاء میں سنگ ہائے میل کی حیثیت رکھتے تھے۔

لیکن بعد میں اُردو زبان نے جس برق رفتاری سے قبولِ عام اور شہرتِ دوام کے ہفت خواں طے کئے وہ بذاتِ خود ایک سحر انگیز حقیقت ہے۔ خواص کے حلقہء باریابی سے نکل کر اور عوام کے دلوں کی دھڑکن بن کر اُردو نے اجارہ شکنی کا بھی عظیم کارنامہ انجام دیا نیز مستقبل کے افق کو نوید کامرانی دیکر تابناک بنادیا چنانچہ آج اُردو ایک عالمی زبان کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے جو کم وبیش ایک ارب انسانوں کے درمیان رابطہ اور اظہار و ابلاغ کا مسلّمہ ذریعہ ہے اس کی دھوم اب صرف جنوبی ایشیا ہی میں نہیں بلکہ چار دانگ عالم میں مچی ہوئی ہے۔

اُردو زبان کی اس ہمہ جہتی وہمہ گیری کا بنیادی سبب اس کی تحلیل وانجذاب کی لسانی صلاحیت ہے جو اسے ایک ممتاز عالمی زبان کا مرتبہ عطا کرتی ہے اس کے نتیجہ میں جہاں اس میں رابطہ کی زبان کی حیثیت سے بے کراں وسعت پیدا ہوئی ہے جو اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ دنیا کی کوئی بھی زبان یا بولی اس کی حریف نہیں بلکہ حلیف ہے وہاں بتدریج اس میں ایک مشترک عالمی تہذیب وثقافت کی تشکیل کے اجزاء پرورش پا رہے ہیں، اُردو میں تخلیق کیا جانے والا ادب جغرافیائی حدود وقیود سے ماورائیت کے واضح اور برملا اشارے دے رہا

ہے۔دوسری زبانوں کی اصناف ادب اُردوادب میں منتقل ہورہی ہیں جبکہ دیگر معروف عالمی زبانوں میں اُردو اصناف ادب کے تراجم لسانی عالمگیریت کے خدوخال مرتب کررہے ہیں۔ اُردو صحافت جس میں سمعی و بصری ذرائع ابلاغ بھی شامل ہیں ایک زبردست قوت بن کر ابھری ہے اور "مملکت کشور کی بے تیغ وتفنگ تسخیر" اس کا مقدر بنتی جارہی ہے۔

ہمارا یہ احساس اس حقیقت کے پیش نظر اور بھی تقویت حاصل کررہا ہے کہ مغرب جس کی زبان ہی نہیں بلکہ تہذیب و معاشرت بھی جو جنوبی ایشیا پر اپنا مکمل تسلط جما چکے تھے اور جن کی گرفت سے ہماری حیاتِ اجتماعی کے مظاہر بلکہ اذہان تک آج بھی آزاد نہیں ہو سکے ہیں خود اُردو زبان وادب کی سحر انگیز آفاقیت کے زیر اثر آتا جارہا ہے اس کا سہرا بالخصوص جنوبی ایشیا سے نقلِ مکانی کر کے مغرب کی طرف جانے والوں کے سر ہے جن میں پاکستانی تارکینِ وطن زیادہ سرگرم و متحرک نظر آتے ہیں' ترکِ وطن ایک مادی مجبوری سہی لیکن حبِ وطن کا نقش ان سفیرانِ وطن کے دلوں پر اور بھی گہرا ہو گیا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں وہ لوگ اب لاکھوں سے بھی متجاوز ہو چکے ہیں' جو اپنے ساتھ اپنی ذہنی و علمی صلاحیتوں کے علاوہ اپنی تہذیب و ثقافت بھی لیکر گئے ہیں اور سرزمینِ وطن سے ذہنی و روحانی رشتے "بُعدِ منزل" کے باوجود مزید مستحکم ہوئے ہیں اسی لئے اپنی شناخت کو قائم و دائم رکھنے کا احساس اور بھی شدید نظر آتا ہے۔ امریکہ میں صرف شکاگو سے دو درجن سے زائد اُردو اخبار و رسائل شائع ہوتے ہیں جو اپنے لاکھوں قارئین میں اُردو زبان اور مشرقی تہذیب و ثقافت کی روایات کے نادیدہ و غیر محسوس عمل کو پروان چڑھانے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ کینیڈا' یورپ اور اسکینڈینیویا کے ممالک سے بھی اخبارات و رسائل کی اشاعت کا ایک لامتناہی سلسلہ وجود میں آچکا ہے اور متعدد پرائیویٹ ٹی وی چینل شب و روز اُردو نشریات بین البراعظمی سطح پر اپنے کروڑوں ناظرین تک پہنچا رہے ہیں۔ مشاعروں کی روایت جو کبھی برصغیر کا طُرہ امتیاز بن گئی تھی اب تیزی سے مغربی ممالک میں جڑیں پکڑ رہی ہے۔

لیکن اس حیات افروز منظر کو داغدار بنانے کا فعل قبیح بھی بدقسمتی سے ہمارے ہی بعض عاقبت فراموش' ہوس گزیدہ اور شعور باختہ نام نہاد اہل قلم انجام دے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں سید عاشور کاظمی کی تازہ تصنیف جو مغرب میں اُردو زبان اور تہذیب و ثقافت پر ایک وقیع تحقیقی کاوش کی حامل ہے بعض تکلیف دہ گوشوں کی بھی نقاب کشائی کرتی ہے یہ تصنیف دو جلدوں پر مشتمل ہے "بیسویں صدی کے اُردو نثر نگار۔ مغربی دنیا میں" اور "بیسویں صدی کے اُردو اخبارات و رسائل ۔۔ مغربی دنیا میں" عنوانات ہی سے ظاہر ہے کہ

فاضل مصنف نے مغرب میں اُردو شاعری کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اس کی معقول وجود کا چبھتا ہوا احساس ہمیں بھی اپنے ایک حالیہ مشاہدہ میں ہوا بلکہ چند روز قبل کراچی کے اخبار ''ڈان'' میں شائع ہونے والے اپنے انگریزی کے ایک کالم (نقطہء نظر) میں انتظار حسین صاحب نے بھی اس ''سہو دانستہ'' پر روشنی ڈالی ہے اور ان پیشہ ور ''دیباچہ نگاروں'' کو بے نقاب کیا ہے جو ذہن فریب ''شاعرانہ عظمتوں'' کا لبادہ زیب تن کر کے آئے دن امریکہ و یورپ میں اپنے فنِ دیوزہ گری کے جوہر آزمانے کے لئے سفر بے رخت پر کمر بستہ رہتے ہیں اور وہاں اُن معصوم و بے ریا لوگوں کو جو شاعر بننے کے ''خبط زر فشاں'' میں مبتلا ہیں اور جو شعر کی ابجد تک سے واقف ہونے کی سعیءِ نامشکور تک کے روادار نہیں اپنی ہوس زر کا سفاکانہ ہدف بناتے ہیں اور وہ بیچارے برضا و رغبت نہ صرف اپنے خون پسینے کی کمائی ان کی نذر کر بیٹھتے ہیں بلکہ ان کے اعزاز میں مشاعرے منعقد کر کے خود بھی بحیثیت شاعر سندِ اعتبار حاصل کرنے کے لئے سرگرداں رہتے ہیں' ایسے نوجوان اکثر ''مطبوعہ دواوین در بغل'' ادبی محفلوں میں بے سروپا ''دیباچوں'' کی عبرتناک بیساکھیوں پر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ شاید اقبال نے انہیں کے لئے کہا تھا کہ:

''نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب''

سعدیؒ تو اپنے سفر چہل سالہ کے تجربات و مشاہدات کا گنج گرانمایہ آئندہ نسلوں کو منتقل کر کے جریدۂ عالم پر اپنا نقش دوام ثبت کر گئے مگر ہمارے قلم پیشہ زائرینِ مغرب جن کا اپنا انشاء و املا تک درست نہیں اصلاح شعر کے نام پر شاعری (جسے حافظ نے ''جزوے ست از پیغمبری'' کہا) کا حلیہ بگاڑ کے ادب کی کونسی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ تقریظ نویسی کو وسیلہء معاش بنانا اور وہ بھی ان معصوموں کا مجرمانہ استحصال کر کے جنہیں خود ہی پتہ نہیں کہ وہ تین تین چار چار شعری مجموعوں کے خالق کس طرح بن بیٹھے کہاں کی شرافت ہے' ادب کے ان سوداگروں کا کردار یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ واپسی پر وطن کے رسائل و جرائد میں رطب و یابس سے مملو ان تحریروں کو بمعاوضہء خطیر چھپوانے کا ٹھیکہ لے کر بھی آتے ہیں اور اگر کبھی یہ ''معصومانِ ادب'' سرزمین وطن پر قدم رنجہ فرمائیں تو بین الاقوامی شہرت کے حامل دانشور اور قلمکار کے طور پر اُن کی پذیرائی کے لئے اعزازیہ محافل کا انعقاد بھی انھیں کا ذمہ ٹھہرتا ہے:

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں کو اسے کیا کہئے

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

نعتیہ شاعری -- قباحتیں اور نزاکتیں

ہم کسی نعت کو اچھے برے خانوں میں تقسیم نہیں کر سکتے کیونکہ نعت کی تخلیق دلی صداقت پر ہوتی ہے۔ البتہ تلازماتِ فن کے پیشِ نظر نعت کے خیالات، زبان و بیان اور مواد و اسلوب کے معیار کی سطحوں پر تنقید کا جواز ہے۔ ہم نعت میں جائزہ لے سکتے ہیں کہ آداب و حدود کی پاسداری کی گئی ہے یا نہیں۔ اور کہیں غلو یا تخفیف کی لغزش تو نہیں ہوئی اور فنی پیمانے کی رو سے وہ نعت کس مرتبے کی ہے۔

حضرت محمد ﷺ کی مدح گوئی اور ثنا خوانی ایک مسلمان شاعر کا جہاں دینی و ایمانی فریضہ ہے، وہیں اس کے شعر و ادب کا بھی ایک عرفانی تقاضا ہے۔ وہ کائنات کی عظیم ترین ہستی جس کا مداح خود خالق حیات و کائنات ہے اور وہ محبوب و مطلوب شخصیت کبریٰ جس کی توصیف و ثنا میں تمام کائنات محو و مشغول ہے اور جو ازل سے ابد تک کی اقلیم پر رفعنا لک ذکرک کا تاج پہنے شہنشاہی کر رہا ہے اور جس کے صدقے میں ہر بشر ہر عظمت و سعادت سے بہرہ ور ہوا، اس کی مداحی ہر شاعر کی اساس شعر اور اثاثہ ادب ہونا چاہیے۔ یہی بنیادی سبب ہے کہ بے شمار شعرا نے صرف نعت گو اور مداحین رسالت کا تخصص پایا اور ان کے مبارک قلم سے صرف نعت کے مضامین ہی ادا ہوئے لیکن دوسرے تقریباً تمام مسلمان شعرا نے ہر صنف شعری میں جزواً اشعار نعت کہے اور اپنے دامان ادب کو گل ہائے نعت و ثنا سے بھی آراستہ کیا۔ ہر زبان کا گلشن نعت کے پھولوں سے مہک رہا ہے اور ہر عہد کی فضاؤں میں ثنائے رسول ﷺ کے نغمے گونج رہے ہیں۔ یہ سلسلہ ازل سے ابد الاباد تک جاری و ساری ہے۔ اس کثرت نعت و مدحت کے باوجود اس محسن کائنات اور ہادی دوسرا ﷺ کے احسانات کے حق کا ایک شمہ بھی ادا نہیں ہو سکتا۔

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر --- ما ہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم

میری اس گفتگو کا مقصد و منشا صرف اس احساس کو تازہ رکھنا ہے کہ حضور ﷺ کی مدح گوئی میں ان تمام آداب و احترامات کو مدنظر رکھنا چاہیے جو اس عظیم ترین ہستی کی حرمت داری کے مقتضیات میں شامل ہیں۔ حضور پاک ﷺ جامع ادبیات و کمالات ہیں۔ آپ کا ہر ارشاد مبارک اور آپ کی زبان مبارک سے ادا

ہونے والا حرف حرف ادب آفریں ہے۔ آپ کی ہر ادائے سیرت بجائے خود ایک نیر تاباں ہے۔ جس سے شعور و ادب کے اجالے طلوع ہوتے ہیں۔ آپ کے کلمات مبارکہ اور احادیث منزہ میں فصاحت و بلاغت کے نکتے پوشیدہ ہیں اور جملہ علوم و معارف کے اسرار و رموز مخفی ہیں۔ ادب آپ کے آفتاب ذات سے طلوع ہوا اور شب ہائے اسالیب و اظہارات کو صبحوں کی صباحتیں آپ کے خطاب و تکلم کے صدقے میں نصیب ہوئیں۔ اسی لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت عظمیٰ کی بلند ترین منزلوں اور ارفع منزلتوں کا اقتضا ہے کہ ہم جب آپ کی نعت کہنے کی کوشش کریں تو ہمیں ادب و احتیاط کی تمام امکانی حدود کے دائرے میں رہنا چاہئے اور بربنائے بے احتیاطی کوئی ایسی بات ہماری زبان یا قلم سے نہیں نکلنی چاہئے جس کی ادائی میں دامان حرمت پر ہماری گرفت کمزور دکھائی دے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم سے کوئی لرزش یا لغزش ہو جائے اور ہم العیاذ باللہ ''حبطِ اعمال'' کا شکار ہو جائیں۔

اسی لئے میں نے چاہا کہ ان باتوں کا ذکر کروں اور ان امور کا جائزہ لوں جو میرے خیال میں موانعات نعت اور ممنوعات ثنائے رسول ﷺ میں داخل ہیں۔ میں نے اس مضمون میں عموماً مثالوں سے اور حوالوں سے عمداً گریز کیا ہے اس لئے کہ مرحوم شعراء تو اب دنیائے آب و گل میں نہیں ہیں لیکن معاصر شعراء یا ان کے ہواخواہوں سے یہ اندیشہ ضرور ہے کہ وہ میری رائے سے متفق نہ ہوں یا مجھ سے خفگی کا اظہار فرمائیں۔ کہیں کہیں میری رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے نہایت خلوص نیت کے ساتھ یہ مضمون لکھا ہے اور حُبِ رسول ﷺ کے تقاضوں کی لطافتیں اور نزاکتیں حرف حرف اور سطر سطر میرے ملحوظ خاطر رہی ہیں...... میرے نزدیک موانعات نعت درج ذیل ہیں:-

(ا) ہم میں سے اکثر شعرا غزل گوئی کے کوچے سے حریم نعت و ثنا میں داخل ہوئے ہیں۔ انہوں نے شعر گوئی کا آغاز غزل سے کیا اور مدتوں غزل ہی کہتے رہے اور حسینانِ مجازی کے لب و رخسار اور زلف و رخسار اور زلف و کاکل کی مبالغہ آمیز توصیف و تعریف میں مستغرق رہے۔ ان کے ذہن و ذوق میں وہ تمام مضامین رچ بس گئے جن کا تعلق جذبات نفس و ہوس سے ہے۔ محبوب کی جسمانیت' ان کی نظروں کا مرکز و محور رہی اور انہوں نے غزل میں زنانِ بازاری کے سراپا پر نہایت ہوس انگیز اور شہوت خیز مضامین باندھے۔ اس طرح غزل میں ''سراپا نگاری'' ایجاد ہوئی اور موئے سر سے ناخن پا تک ایک ایک عضو کی جزئیات نگاری کا حق ادا کیا گیا۔ اس عشقِ مسلسل اور وظیفۂ متواتر سے غزل گو شعرا کے ذہن میں ایک خاص سانچہ تشکیل پا گیا جس

کے سبب غزل کی ایک خاص فضا' خاص لب ولہجہ' خاص اسلوب' خاص زبان و بیان اور خاص خیالات و مضامین بلکہ مختصراً یوں کہئے کہ سوچ اور اظہار کا ایک منفرد و ممتاز انداز قائم ہو گیا۔ جب ان متغزلین نے نعت گوئی شروع کی تو اپنے ذہن و قلم کو اس غزلیہ فضا سے آزاد نہ کر سکے اور محبوبان مجازی کے وہی تلازمات و لوازمات نعت میں صرف کرنے لگے اور (خصوصاً) ''سراپا نگاری'' کو غزل کی اسی سطح احساس پر رکھا۔ بعض شعراء یقیناً اس سے مستثنیٰ ہیں لیکن مقام افسوس ہے کہ شعراء کی ایک بڑی تعداد موضوع اور اسلوب اور مضامین میں وہ ترفع پیدا نہ کر سکی جو اس ارفع و اعلیٰ ہستی کے مقام و منزلت کا تقاضا ہے۔ آپ کسی ذہنی تحفظ کے بغیر نعتیہ مجموعوں کا مطالعہ فرمائیے۔ آپ کو ایسے اشعار بکثرت ملیں گے جن سے حضور پاک ﷺ کے اسم گرامی کو جدا کیجئے تو وہ خالصاً غزل کے اشعار ہوں گے اور انہیں کسی بھی مجازی محبوب سے چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح طیبہ و بطحا یا عرب کے خاص ماحول کو ان شعروں سے منہا کیجئے تو وہ محبوب مجازی کے کوچہ و بازار کی ترجمانی کریں گے۔ میں مانتا ہوں کہ نعت میں ''شعریت'' بہ ہر حال ہونی چاہئے اور پیرایہ تغزل میں نعت کہنا لائق مواخذہ نہیں لیکن موضوع کی رفعت کے ساتھ ساتھ زبان و بیاں کی نجابت' جذبہ و خیال کی طہارت اور سلیقہ اظہار و ادا کو فضائے تغزل سے یکسر مختلف و ممتاز ہونا چاہیے۔

(۲) مقام رسالتؐ میں جسارت و بے تکلفی کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ لہجے میں بے باکی ہمیں دنیا و آخرت میں برباد کر سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ خیر الانام اور فوق البشر ہیں۔ نعوذ باللہ ہماری سطح کے بشر نہیں ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنی فوقیت و برتری کے مقام پر فائز ہونے کے باوجود بارگاہ عظمت رسول ﷺ میں ''لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی'' کے حکم ربانی کے محکوم و مامور تھے۔ کیا ہمیں نعت گوئی میں کوئی بے تکلفی زیب دیتی ہے؟ کیا ''قم یا حبیبی کم تنامی'' کا لہجہ ہمارے لئے زیبا ہے؟ ہم بعض نعتوں میں ایسے مضامین دیکھتے ہیں کہ امت کا استغاثہ پیش کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ آپ قبر مبارک سے کب ظہور کریں گے؟ یہ نیند کب تک؟ باہر تشریف لائیے اور ملاحظہ کیجئے آپ کی امت کا کیا حال بد ہے۔ اول تو یہ سوچتے ہوئے دل کانپتا ہے کہ حضور ﷺ کو احوال امت پر توجہ دلائیں۔ ہم توجہ دلانے والے کون ہیں؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر تو عطیہ خداوندی سے تمام احوال و آثار منکشف ہیں۔ پھر ہم میں یہ جسارت کیسی؟ کہ باہر تشریف لائیے۔

اس مضمون میں یہ اضافہ بھی محل غور ہے کہ آپ ظہور نو فرمائیے۔ آپ ایک بار فلسطین میں آئیے۔ مسجد اقصیٰ آپ کی منتظر ہے...... یہ حضور علیہ السلام کا ظہور ثانی اور اس کا تقاضا کیا شے ہے؟ یہ کس قسم کی بعثت

ہوگی؟ حضور ﷺ تو مبعوث ہونے کے بعد ابد تک کے لئے نبی ہیں۔ آپ کی شریعت ہمیشہ کے لئے ہے۔ آپ خاتم الانبیاء ہیں۔ قرآن آخری کتاب ہے۔ حضور ﷺ کی نبوت زندہ و پائندہ ہے۔ پھر ان کا ظہور مکرر چاہنا کس جواز کے تحت ہے؟

(۳) بعض اوقات ہماری مطالعے سے یہ "آشوب" بھی گزرتا ہے کہ ہم حضور علیہ السلام کی توصیف میں افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کبھی تو کسر شان کا یہ انداز کہ انہیں اپنا سا بشر سمجھتے ہیں یا غزل کے مضامین کا ان کو مورد قرار دیتے ہیں اور کبھی از راہ مبالغہ و مغالطہ انہیں اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات و اختیارات کا حامل قرار دیتے ہیں۔ اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کچھ نہیں اس لئے سب کچھ حضور ہی سے مانگنا ہے۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین کی آیت کو سامنے رکھتے ہوئے توحید کے تمام مخصوصات کو حضور علیہ السلام کی ذات مبارکہ میں مرکوز و محدود کر دینا نہ حضور علیہ السلام کو پسند خاطر ہو سکتا ہے نہ اللہ کی شان کبریائی اسے قبول کرے گی۔ حضور ﷺ تو شان نبوت کے باوصف خود کو مقام عبدیت پر رکھتے ہیں اور ہم حضور علیہ السلام کو خدائی اختیارات سے متصف کر کے آپ کی اور اللہ کی (یعنی دونوں کی) نفی ذات کرتے ہیں۔ ہم احد اور احمد میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتے۔ بس ایک پردہ میم پڑا ہوا ہے۔ یہ پردہ اٹھائیے تو احمد بھی احد ہے۔ کیا نعت کے ایسے مضامین قرآن وسنت کے مزاج کے مطابق اور دانش و معرفت کے اصول و اطلاق سے مناسبت رکھنے والے ہیں؟

(۴) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علوم و معارف کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ ازل سے ابد تک اس عالم ممکنات میں جو اصحاب عقل و دانش پیدا ہوتے رہیں گے اور ارباب کمال، عروج و رفعت کی جن بے کرانیوں تک رسائی کریں گے وہ حضور ﷺ ہی کے علوم و معارف کے انوار کے خوشہ چیں ہوں گے۔ اس کے باوجود حضور ﷺ کی ذات مبارکہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے علوم کے بے پایاں سمندر میں سے اتنے ہی علوم عطا کئے ہیں جتنے اس علیم و خبیر نے چاہے ہیں (اور ان کی بھی کوئی حد و انتہا نہیں ہے) تاہم حضور علیہ السلام کے علوم "عطا کردہ الٰہی" ہی ہیں اور حضور ﷺ اللہ کے تمام تر علوم کے حامل نہیں ہیں۔ چنانچہ نعت میں اس نازک نکتے کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور حضور پاکؐ کو بلحاظ علوم و معارف "اللہ" قرار نہیں دینا چاہئے۔ نعتوں کے مطالعے سے ایسے مقامات بھی نظر سے گزرتے ہیں جب آپ کو اللہ ہی کی مانند عالم غیب و شہود قرار دیا گیا ہے۔

(۵) یہیں ایک اور نازک بات نہایت برمحل ہو گی کہ تمام صحابہ عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کی بارگاہ علم کے تربیت یافتہ، آپ کی نگاہ التفات کے فیض یافتہ اور آپ کی درس گاہ اخلاق و سیرت کے پروردہ

تھے اور یقیناً تبلیغ دین میں آپ کی مصاحبت اور رفاقت کی سعادت سے مشرف تھے۔ اسلام کے فروغ اور دین کی اشاعت میں وہ آپ کے انصار و معاونین میں تھے اور اطاعت، نیازمندی اور فرماں برداری کی صفات عالیہ سے مزین تھے۔ اس کے باوجود حضور علیہ السلام اور ان میں وہی فرق تھا جو ایک معلم اور تلامذہ میں، ایک مطاع اور مطیعوں میں، ایک مقتدا اور مقتدیوں میں ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام کار رسالت اور امور تبلیغ میں ان کے ہادی و مخدوم و پیشوا تھے اور وہ سب آپ کے حلقہ خدمت و ارادت میں منسلک تھے۔ حضور ﷺ امور اسلام و شریعت میں ان کے "محتاج" نہیں تھے۔ اگر نعت میں کوئی ایسا خیال نظر سے گزرے کہ حضور علیہ السلام کی نبوت صاحب احتیاج تھی اور کار رسالت ناقص اور ادھورا رہ جاتا اگر فلاں یا فلاں صاحب اعانت سے ہاتھ کھینچ لیتے۔ یعنی کسی بھی صحابی کو "شریک نبوت" قرار دینے کا خیال اگر کسی نعت و ثنا میں آپ کی نگاہ کا دامن کش ہو تو کیا آپ اسے منافی شان رسالت اور مخالف منشا و مقاصد نبوت قرار نہیں دیں گے؟

(۶) نعت میں بعض ایسے وجدانی مقامات آتے ہیں جن میں جذبات کا والہانہ پن ہم پر غالب ہوتا ہے اور ہم نشاط و سرشاری کی ایک کیفیت میں ملفوف ہوتے ہیں۔ اس مقام پر اگر احتیاط دامن گیر نہ ہو تو بہت سی لغزشیں وارد ہو سکتی ہیں۔ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ غلبہ عشقِ رسول ﷺ کے باوجود یہ مستی و بے خودی کا مقام نہیں ہے۔ کتنی ہی مغلوبیت ہو، در رسول علیہ السلام پر سجدہ گزاری کا مضمون خلاف توحید پرستی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے در پر جبین عقیدت تو خم کی جا سکتی ہے لیکن اسے سجدے کا قائم مقام قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اسی طرح یہ مقام دیوانگی، مدہوشی، گریباں دریدگی کا نہیں ہے۔ "باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" کی شرائط پر چلنا پڑتا ہے۔ دامانِ حزم و احتیاط پر گرفت رکھنا لازمی ہے۔ مدینہ منزل ادب ہے۔

بارگاہ رسول ﷺ ع

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر

یہ "نفس گم کردہ می آید" کی منزل ہے لیکن گم شدگی انفاس کو تقاضائے ادب کی ذیل میں آنا چاہیے نہ کہ تلازمات بے خودی میں۔ آپ "می رقصم" کی ردیف لا کر دربار رسالت میں رقص فرمانے لگیں یا

"ترے دربار میں آ کر قلندر رقص کرتا ہے"

کہنے لگیں تو حضور رسالت مآب ﷺ کی طبع لطیف پر یہ بات کتنی گراں گزر سکتی ہے؟...... اسی طرح عالم بے خودی میں اپنے مقام عشق کو اتنا جذاب قرار دینا کہ

''وہ آئیں گے اور ان کو آنا پڑے گا''

یعنی میرا جذبہ طلب اتنا صادق ہے کہ میرے خواب میں یا میرے تصور میں حضور علیہ السلام خود تشریف آوری کی زحمت فرمائیں گے...... یہ کتنی جسارت بے جا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک کس حد تک قابل مواخذہ ہو سکتی ہے!

پس نعت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر جمیل ہو یا دیار حبیب کی حاضری وحضوری کا بیان ہو' ادب' احتیاط' ہوشمندی اور سلامتی ہوش وحواس کے ساتھ اس جادہ نازک سے گزرنا چاہیے۔

اس شہر میں ہاتھوں سے نکل جاتی ہیں صدیاں اک لمحہ گزر جائے اگر بے خبری کا

(عاصی کرنالی)

(۷) ضمائر کے استعمال میں واحد غائب کے لئے ''وہ'' اور واحد حاضر کے لئے ''تو'' کا استعمال مناسب ہے یا نا مناسب ہے' یہ ایک بحث دیر سے جاری ہے۔ جو ان ضمائر کے حق میں نہیں ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ ضمائر حضور علیہ السلام کی عظمت کے منافی ہیں۔ آپ' جناب' حضور' حضرت' کہنا چاہئے۔ یقیناً اس بات میں بڑا وزن ہے اور یہ تعظیمی ضمائر ہی حضور ﷺ کی شان وعظمت سے مناسبت رکھتی ہیں۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ''وہ'' اور ''تو'' کا استعمال اردو میں کیوں شروع ہوا اور اب تک جاری کیوں ہے؟ اردو شاعری زیادہ تر فارسی اور عربی کی متبع ہے۔ عربی میں واحد شخص کے لئے ھو اور انت استعمال ہوتے ہیں اور مختلف شکلوں میں یہی وحدت قائم رہتی ہے۔ ورفعنا لک ذکرک میں اسی وحدت کا تلازمہ ہے۔ اگر تثنیہ اور جمع کے ضمائر استعمال کریں تو واحد شخص پر ان کا اطلاق نہیں ہوتا۔ فارسی میں ''او'' اور ''تو'' سے ایک شخص مراد ہوتا ہے جبکہ ''شما'' اور ''ایشاں'' میں وحدت نہیں اجتماع ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

نسخہ کونین را دیباچہ اوست جملہ عالم بندگان وخواجہ اوست

اسی تلازمہ ضمائر کے ساتھ فعل بھی واحد استعمال ہوتا ہے:-

یتیمی کہ نا کردہ قرآں درست کتب خانہ چند ملت بہ شست

اردو زبان میں اسی روش کی تقلید کی گئی اور اکابرین نعت اسی نہج پر قائم رہے۔

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

(حالی)

اسکی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا
(غالب)

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
(اقبال)

واحد ضمائر کے استعمال کا دوسرا سبب فنی ضرورت ہے۔ شعر اوزان و بحور کی قید میں ہوتا ہے اور بیت کے ظرف میں لفظ کو گنجائش کے مطابق لانا پڑتا ہے۔ جہاں "تو" آ سکتا ہے "آپ" نہیں آ سکتا۔ جہاں "تیرا" کی گنجائش ہے "تمہارا" اور "آپ کا" استعمال نہیں ہو سکتے۔

امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے (کی بجائے) امت پہ "آپ کی" آ کے عجب وقت پڑا ہے
(کیسے لائیں گے)

یا لوح بھی آپ، قلم بھی آپ، آپ کا وجود الکتاب (کیسے ممکن ہوگا!)

بعض اوقات شعر یا بند نظم کا مزاج ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہاں اگر واحد کی جگہ جمع کی تلازمات لائیں تو یوں گمان گزرتا ہے جیسے ایک سے زیادہ اشخاص کا ذکر ہے مثلاً اگر مسدس حالی کے اس بند کو بہ شکلِ ذیل پڑھیں تو کیا حضور ﷺ کی وحدت شخصی اس تبدیلی پیرایہ کے ساتھ ذہن میں آ سکتی ہے؟

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والے مرادیں غریبوں کی بر لانے والے
اتر کر حرا سے سوئے قوم آئے اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لائے

اس کے باوجود اگر اوزان و بحور گنجائش دیں تو تعظیمی ضمائر ضرور استعمال کرنی چاہئیں مثلاً

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہی تو ہو ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمہی تو ہو
(ظفر علی خاں)

ہر نبوت کے لئے وقت پہ جانا ٹھہرا آپ آئے تو نہ جانے کے لئے آپ آئے
(عاصی کرنالی)

دانش میں خوف مرگ سے مطلق ہوں بے نیاز میں جانتا ہوں موت ہے سنت حضور کی
(احسان دانش)

میرے خیال میں شعراء کو یہ کوشش ضرور کرنی چاہئے کہ حضور ﷺ کا ذکر جمیل ہر ممکن تعظیم و تکریم کے ساتھ ہی ہونا چاہئے۔ تاہم اگر شعر کا فنی دروبست اور عربی و فارسی قواعد کا اتباع ضمائر واحد کی طرف لاتا ہے تو

اسے سوءِ ادب پر محمول نہیں کرنا چاہئے۔ سینکڑوں شعرا نے عربی فارسی اور اردو میں اس نہج کو برتا ہے اور برت رہے ہیں۔ کیا العیاذ باللہ وہ نبوت کی ارفع و اعلیٰ منزلت اور حضورﷺ کی ذات محترم و مکرم کے بارے میں کسی تخفیف کے مرتکب ہو رہے ہیں؟

(۸) بالکل یہی صورت لفظ ''یثرب'' کے استعمال کے بارے میں ہے۔ یثرب مدینہ منورہ کے ناموں میں سے ایک ہے۔ اس لفظ کے معانی فساد یا ہلاکت کے ہیں۔ اظہر محمود مدینۃ الرسول کے اسمائے مقدسہ کے ضمن میں لکھتے ہیں:-

> ''ابن زبالہ جو مورخین مدینہ کے پیشوا مانے جاتے ہیں اور من جملہ اصحاب امام مالک سے ہیں اور دوسرے حضرات نے بھی علماء سے روایت کیا ہے کہ مدینہ منورہ کو یثرب نہ کہا جائے۔ صحیح بخاری میں ایک حدیث آئی ہے کہ جو شخص ایک دفعہ یثرب کہے تو اس کو لازم ہے کہ اس کے تدارک میں دس مرتبہ طیبہ کہے...... بعض احادیث میں مدینہ منورہ کا نام یثرب آیا ہے۔ اس کے لئے علماء کرام کہتے ہیں کہ یہ ممانعت سے پہلے کا ہے۔''

تاہم بعض شعرا نے ''یثرب'' استعمال کیا ہے:-

دشت یثرب میں ترے ناقے کے پیچھے پیچھے　　دھجیاں جیب و گریباں کی اڑاتے جاتے

(کافی)

گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے　　اے تاجدارِ یثرب و بطحا تمہی تو ہو

(ظفر علی خاں)

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است　　ای خنک شہری کہ آنجا دلبر است

(اقبال)

اس کے باوجود ہماری رائے میں اس سے اجتناب ہی بہتر ہے لیکن جو شعرا استعمال کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں، ان کے عشق و اطاعت کے بارے یا علم و فضل کی بابت سوءِ ظن مناسب نہیں ہے۔

(۹) نعت کہتے ہوئے جذبے کی طہارت، خیال کے علو، مضمون کی رفعت اور ذہن و فکر کی تمام تر نظافت و لطافت کی پاسداری لازم ہے۔ ایسے مضامین سے اجتناب درکار ہے جن میں سطحیت و ابتذال ہو، قرآن و سنت کے مزاج سے انحراف ہو، نبوت کے استخفاف کا کوئی ہلکا سا پہلو نکلتا ہو، یا ایک ایسی ذو معنویت ہو

جو منفی اور انحرافی سمت کی جانب لے جائے۔ ہم چند مثالیں دیتے ہیں اور بعض نعتیہ شعروں کو یا ان کے صرف مفہوم کو یا انہیں نثری شکل دے کر لکھتے ہیں اور ہمیں جو اشتباہ یا اشکراہ پیدا ہوا ہے، اس کا ذکر کرتے ہیں:-

☆ اپنے آپ کو سگِ کوئے نبی کہنا یا اس سگ سے نسبت دے کر خود کو اس سے بھی کمتر قرار دینا۔

عجز و انکسار ہمارے لئے شرط اطاعت ہے۔ اپنی کمتری کا اعلان و اقرار بھی ضروری ہے لیکن سگ کوئے نبی کا تلازمہ کراہیت رکھتا ہے۔ کتا نجس شے ہے، بے عقل ہے، بول و براز کے لئے جا، بے جا نہیں دیکھتا۔ ان کے کوئے مقدس سے اسے منسوب کرنا نہایت کراہیت کا موجب ہے۔ غزل میں "سگِ لیلیٰ" کا بہت چرچا ہے۔ وہیں سے نعت گو شعرا یہ خیال لے اڑے حالانکہ۔

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامی دارد

☆ دل مرا غارِ حرا ہو جیسے.........

......ہمارا دل کتنا ہی مقدس و مزکی ہو ہم غارِ حرا کے تقدس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ انسانی قلب یقیناً پاکیزہ خیالات کا حامل ہو سکتا ہے لیکن اسی دل میں وساوس و اوہام اور نفسانی خیالات کی آمد وشد بھی تو رہتی ہے جبکہ غارِ حرا میں اس مقدس ہستی کا قیام رہا جس کے قلب اقدس میں انوار و تجلیات الٰہی کا نزول رہتا تھا۔

☆ بیمارِ محمد ہوں میں بیمارِ محمد.........

......حضور ﷺ کی مسیحا نفسی کے یقین کی صورت میں خود کو بیمار محمد کہنا ایک مریضانہ احساس ہے۔ اسی طرح:

الٰہی! مجھ کو ہمیشہ غمِ رسول ملے

یہ غمِ رسول کیا ہے؟ ممکن ہے کسی صاحب نے غم حسین کی دعا مانگی ہو، جو حسین شہید کے تناظر میں بالکل جائز طلب ہے، اور بعد میں انہیں "سلام" کی بجائے "نعت" کہنی پڑی ہو اور انہوں نے "غمِ رسول" لکھ کر اس ترمیم سے کام چلا لیا ہو۔

حضور ﷺ کے تصور و خیال کے ساتھ ایسے مضامین آنے چاہئیں جن میں توانائی، رعنائی اور صحت و سلامتی کی فضا ہو۔

☆ میں تو پھرتا ہوں سدا اوڑھ کے سایہ تیرا

یا

میں نے حضور کا سایہ پہن رکھا ہے

......کیا یہ اسلوب واضح ہے؟ کیا اس مصرع کے کوئی معانی نکلتے ہیں؟ اور اگر شاعر حضور ﷺ کا سایہ پہن لیتا ہے تو کیا اس میں عجز کی بجائے وہ افتخار تو نہیں جس کے ڈانڈے پندار و تکبر سے ملتے ہوں۔

☆ ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

......بے حد پرکشش اور سحر آفریں شعر ہے۔ لیکن خدانخواستہ اس شعر کے مضمون کا کوئی منفی رخ تو نہیں نکلتا۔ صبح کو رسول علیہ السلام کا قائم مقام قرار دیا ہے......

اگر رسول نہ ہوتے...... رسالت کی ضرورت و اہمیت سے بے نیازی۔

ہم ایسے اہل نظر کہہ کر خود کو علم و آگہی کے اس مقام منتہی تک پہنچانے کا عمل جہاں رسول ﷺ کی بعثت و ظہور کی بجائے صرف مظاہر فطرت سے گزارا ہو سکتا ہے۔ خدانخواستہ اس میں انکار رسالت کا تو شائبہ نہیں۔ اگر میں شعر کا صحیح مفہوم و منشا متعین نہ کر سکا ہوں تو خدا مجھے تشریح و تعبیر کی اس سوءظنی پر معاف فرمائے!......

☆ کاش آپ کی اونٹنی میرے دروازے پر آ کر ٹھہرتی اور میرا گھر ہی ابوایوب کا گھر ہو جاتا۔

......بے حد مبارک جذبہ ہے اور رشک و منافست کی ایک عمدہ مثال ہے

لیکن کیا یہ شعر ہمارے ذہن کو غلط سمت میں تو بہا کر نہیں لے جاتا؟

حضور ﷺ کی اونٹنی ابوایوبؓ کے گھر کی بجائے میرے گھر پر ٹھہرتی۔

اونٹنی تو مامور من اللہ تھی اور انہی خوش نصیب صحابی کے گھر کے سامنے اس کا رکنا مقدر تھا۔ اس شعر میں مشیت الٰہی پر تنقید ہے اور تقدیر خداوندی کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ اگر ابوایوبؓ کی جگہ میں ہوتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ بے شک اس شعر میں یہ آرزو مچلتی ہے کہ میں عہد رسالت میں ہوتا اور مقام صحابیت پر فائز ہوتا اور اس

عہد مبارک کی ایک عظیم برکت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا لیکن اس میں خدا سے لے کر ناقہ رسول تک سب کو خطا کی ایک لڑی میں پرو دیا گیا ہے۔

رشک کی ایک خوبصورت مثال نہایت سلیقہ مندی اور تاثر آفرینی کے ساتھ اقبال کی نظم ''بلال'' میں ملتی ہے:-

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری | کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا | خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

مجھے ہو کثرت عصیاں سے کیا ڈر | مرے آقا شفیع عاصیاں ہیں

...... کثرت عصیاں پر فخر اس لئے کہ حضور ﷺ شفاعت فرمائیں گے۔ گناہوں پر نہ ندامت' نہ توبہ و انابت' اس سے بڑی شوخ چشمی اور دیدہ دلیری کیا ہوگی! کوئی شخصیت کتنی ہی عادل اور صاحب فضل و کرم کیوں نہ ہو' اگر مجرم جرم پر فخر کرے اور کہے کہ عدالت کے اعتماد کرم پر میں نے گناہ کئے' کثرت جرائم میں مخمور رہا اور مجھے کوئی خوف تعزیر نہیں تو اس اقرار جرم اور افتخار جرم پر کوئی عدالت اسے کس طرح باعزت بری کر سکتی ہے؟

☆ اے میرے کھویا مجھے طوفاں کا نہیں غم | بس تم ہی لگا دو مری کشتی کو کنارے

یا

اٹھ کے وہ چل دیئے' کہتے ہی رہ گئے ہم فسانہ | ہائے ہائے یہ ظالم زمانہ

فلموں کے گیت جن دھنوں میں تیار ہوتے ہیں' ان کو پس منظر میں رکھ کر اس خیال کے تحت نعت کہنا کہ یہ ہر زبان پر چڑھ جائیں گی' احترام نعت کے منافی عمل ہے۔ جب ایسی نعت پڑھی جاتی ہے تو سامع کے ذہن میں فلمی طرز گونجتی ہے اور اس فلمی گیت کی پچویشن دماغ میں گردش کرتی ہے۔ پھر ایسی نعت میں شاعر ''فلمیت'' ہی کی شعری فضا پیدا کرتا ہے اور ایسے الفاظ لاتا ہے جو فلمی گیت کے مزاج کے لئے سازگار ہیں' اسی لئے ایسی نعت میں نہ کوئی احساس تقدس ہوتا ہے نہ تصور معیار۔ نعت خواں ٹولیاں بھی ایسی نعتوں کو انہی فلمی طرزوں پر گاتی ہیں مثلاً

اے میرے کھویا.....' کو پڑھتے یا سنتے وقت یہ گانا ذہن میں گردش کرتا ہے:-

آجا مری برباد محبت کے سہارے | ہے کون جو بگڑی ہوئی تقدیر سنوارے

اسی طرح اٹھ کے وہ چل دیئے...... والے گیت کی طرز پر کہی ہوئی یہ نعت ذیل ہمیں اسی فلمی فضا میں لے جاتی ہے۔

تعظیم سے لیتا ہے خدا نام محمدؐ　　کیا نام ہے اے صلِ علیٰ نام محمدؐ

نعت نگاروں کو ایسی کوشش سے احتراز واجب ہے۔ ہماری رائے میں یہ عمل سوءادب کے مترادف ہے۔

(۱۰) نعت کے مخصوص مضامین وخیالات وتلازمات کو کسی اور شخصیت سے منسوب کرنا، یعنی کسی میر وسلطان یا مشاہیر اسلام اور بزرگان دین کے بارے میں ایسی توصیف جو صرف حضور علیہ السلام ہی سے مختص ہو سکتی ہے، نہایت ناپسندیدہ بلکہ میرے عقیدے کے مطابق قابل مواخذہ ہے۔ قصائد کا مطالعہ کیجئے۔ بعض شعرا نے اپنے ممدوح سلاطین وامرا سے وہ صفات وتوصیفات منسوب کر دی ہیں جن کا اطلاق وانطباق صرف اور صرف ممدوح کبریا، محبوب دوسرا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی پر ہو سکتا ہے مثلاً کسی بادشاہ کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ کائنات اس لئے خلق کی گئی تھی کہ خدا کو آپ جیسے سلطان عادل کی پیدائش مقصود تھی (نعوذ باللہ من ذالک)۔ یا رحمدلی، عدل، احسان اور مکارم اخلاق کے اعتبار سے (محض حصول انعام کے لالچ میں) کسی دنیادار بادشاہ کو ان صفات سے متصف قرار دینا اور وہ بھی اتنے غلو کے ساتھ کہ حضور ﷺ کی شخصیت کی تنقیص اور استخفاف کا پہلو نکلتا ہو۔ (استغفر اللہ)۔ یہ سارے امور احتیاط کے متقضی ہیں۔ ذرا سی بے احتیاطی بربادی وہلاکت کا سبب بن سکتی ہے......

(۱۱) اپنے مقالے کو اختتام تک لاتے ہوئے ایک نہایت اہم بات کہنا چاہتا ہوں کہ نعت کا تعلق جذبے کی سچائی، نیت کے خلوص اور ایمان کی انتہائی صداقت اور تمام تر جذبات عشق واطاعت پر موقوف ہے۔ اگر نعت گوئی سے شاعر کی مراد ومنشا کوئی دنیوی جلب ومنفعت، کوئی خواہش انعام، کسی ایوارڈ کا حصول، کوئی نمود پسندی ہے تو ایسی نعت اخلاص سے خالی ہے اور یہ کوشش بے اجر وبے ثمر ہو سکتی ہے۔ بعض شعرا محض ٹی وی اور ریڈیو پر پڑھنے کے لئے فرمائشی نعت لکھتے ہیں بلکہ (خدا مجھے سوءظن سے بچائے) بعض شعرا تو آئے ہی اس طرف اس لئے ہیں کہ ٹیلیویژن سے ان کی نعت ٹیلی کاسٹ ہوتی ہے یا حکومت یا متعلقہ وزارت اس سلسلے میں سالانہ انعامی مقابلے کا اہتمام کرتی ہے۔ اگر کوئی شاعر صاحب دل ہے اور اس کا ضمیر زندہ ہے اور اسے اپنے پیارے رسول ﷺ سے محبت ہے تو کیا وہ اپنی نعت کی تعمیر ایسی کمزور اساس پر اٹھا سکتا ہے؟........

(۱۲) نعت کے بارے میں ایک عمومی احساس یا رویہ یہ ہے کہ نعت تمام تر عقیدت کی پیداوار ہے

اورعقیدت کا اظہار ہے۔اس لئے عقیدت کے اس مال میں کسی ''معیار'' کی کوئی شرط نہیں ہے۔جیسی بری بھلی' کمزور' پھسپھسی تخلیق ہوگی' سرکارﷺ اسے پسند فرمالیں گے۔ہم کیا' ہماری بساط فن وفکر کیا؟ یہ تو عجز اظہار و بیان کا مقام ہے۔ہماری فکر پر شکستہ ہے' ہمارا ذہن عاجز ہے' ہمارا قلم بے دم ہے وغیرہ وغیرہ......... ہم مانتے ہیں کہ نعت بہت حد تک اظہار عقیدت ہے لیکن ایک بات پر غور کیجئے۔آپ اپنے کسی عزیز یا دوست کو گلدستہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔آپ تازہ' خوش رنگ اور خوشبودار پھول چنیں گے' ان کی پتیوں کو گرد و غبار سے صاف کریں گے' غیر ضروری پتیوں کی بیرائش کریں گے' انہیں ریشمی یا زریں ڈوری میں باندھیں گے اور ایک خوبصورت گل دان میں رکھ کر اور سجا کر حضور دوست پیش کریں گے۔یہ اہتمام ایک اپنے جیسے شخص کے لئے ہے۔جب آپ اس بہار چمنستان ایجاد کی بارگاہ لطافت میں گل ہائے نعت وثنا پیش کرنا چاہیں گے تو اسے عقیدت کا اظہار نامہ کہہ کر اس کی زیبائش میں کوئی شعوری اہتمام نہیں کریں گے؟ یہ کس قدر حیرت وافسوس کا مقام ہے' مشاعرہ ہوتا ہے۔اہل فضل وکمال کی مجلس ہے۔آپ بار بار بیاض دیکھیں گے اور اپنے خیال وہمت کے مطابق بہترین کلام اس مجلس میں پیش کرنے کے لئے چنیں گے۔لیکن نعت کو مال عقیدت کہہ کر سہل انگاری اختیار فرمائیں گے۔حضورﷺ ادیب کامل' نقاد اعظم' تمام علوم وادبیات کے مصدر ومنبع اور تمام تر دانش وآگہی کے سرچشمہ عظیم ہیں۔آپ کے کمال نقد ونظر کی مثالیں تاریخ وسیر کے ذخیروں میں محفوظ ہیں۔آپ کی برمحل اصلاحیں آپ کے ارتقائے فکر وانتقاد پر دلالت کرتی ہیں۔اس لئے نعت گو اصحاب پر لازم ہے کہ وہ موضوعات' افکار' خیالات' مضامین' تفکر' اظہار' زبان' بیان' ہیئت' اسلوب الغرض نعت کے تمام تر معنوی اور فنی جمالیات پر نظر رکھیں' جذبہ وخیال کے علو پر نعت کی اساس اٹھائیں' صحیح اور مستند معلومات سے کام لیں۔قرآن وحدیث سے باخبری' شریعت وسنت سے آگاہی' شعر وادب کے فنی نکات اور قرینہ وسلیقہ مندی کے آداب کو ملحوظ رکھیں۔ عظمت منصب رسالت اور مقصد ومنشائے نبوت کی فضا میں شعر کہیں۔لوازمات نعت میں یہ احساس بھی ضروری ہے کہ جہاں آپ کی نعت جمال وجلال وکمال محمدیؐ کے جلوؤں کی آئینہ دار ہو' وہیں آپﷺ کی سیرت مقدسہ کے اجالوں کے ابلاغ اور حضورﷺ کی تعلیمات واحکام کی تبلیغ کا ذریعہ بھی ہو اور سب سے بڑی بات یہ کہ جو نعت آپ کے ذہن وقلم سے وارد ہوئی ہے' اس کے مضامین کا اطلاق آپ کی اپنی ذات پر بھی ہو' آپ خود حسن فکر اور حسن عمل کے سانچے میں ڈھل کر اطاعت واتباع رسولﷺ کا ایک چلتا پھرتا نمونہ بن جائیں۔آپ اپنے معاشرے کو نعت وثنا کے مضامین کا عامل' اسی وقت بنا سکیں گے جب آپ اپنی شعری

صلاحیت کے علاوہ اپنی ذات سے بھی اس کا ثبوت پیش کریں گے۔ نعت کہہ کر آپ خود سرتا پا نعت بن جائیں...... مدح رسالت علیہ کا یہ بدیہی اجر تو ہمہ وقت میرا اور آپ کا منتظر ہے۔

مدح سیرت جو کی تو خود کو بھی   پیر و اسوہ ہائے کامل کر
یعنی جب نعت کر چکے تخلیق   نعت کو اپنے دل پہ نازل کر

(عاصی کرنالی)

لوگ جھجکتے تھے کہ جو اشعار سرکار رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں نذر عقیدت ہیں ان پر قلم اٹھانا اور ان کے بارے میں تنقید کی جرات کرنا غیر مناسب بلکہ ایک طرح سے نعت کے تقدس کے منافی ہے۔ حالانکہ نعت کا نذر عقیدت ہونا ہی اس جذبے کا محرک ہے کہ حضور علیہ کی درگاہ ادب میں جو نذر پیش کی جائے وہ کس قدر خالص، بے عیب اور منزہ ہونی چاہئے اور اس میں فنی اور معنوی سلامت روی اور حزم و احتیاط برتنے کی کس قدر ضرورت ہے۔

نعت کے موضوع پر تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا الحمد للہ سلسلہ چل نکلا ہے اور متعدد اہل قلم نے اس میدان میں قدم رکھا ہے اور نہایت ادب آمیز جرأت کے ساتھ بہت سی کام کی باتیں لکھی ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ احتیاط کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی نعتیہ شعر پر تحسین کی جاتی ہے تو شاعر کا نام درج ہوتا ہے۔ اگر کہیں تنقید و تعریض ہوتی ہے اور کوئی اختلافی بات لکھی جاتی ہے تو شاعر کا حوالہ حذف ہوتا ہے۔ یہ روش نہایت قابل تعریف ہے۔ بات بھی ہو جاتی ہے اور پردہ بھی رہ جاتا ہے۔ اس روش کو اگر اسی طرح برتا جائے تو زیادہ کھل کر بات ہو سکتی ہے۔ اگرچہ بعض ناقدین نے اختلاف کے مواقع پر نعت گو کا نام بھی لکھ دیا ہے، اس سے شاعر شرمندہ ہوتا ہے اس لئے پردہ کشائی سے اجتناب ہی مناسب ہے۔ یہ پردہ داری اس لئے بھی ضروری ہے کہ جہاں اس سے اخلاقیات کا ایک تقاضا پورا ہوتا ہے، وہیں نقاد کے لئے بچاؤ کی صورت بھی نکلتی ہے۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ نقاد کو خامی کی نشان دہی کرتے ہوئے خود کوئی سہو ہو گیا ہو۔ سو شاعر کا نام نہ لکھنے سے شاعر اور ناقد دونوں ہی کی پردہ داری کا تلازمہ پورا ہو جاتا ہے۔

اب مجھے تنقید نعت کے دوسرے رخ پر بات کرنی ہے۔ اس امر کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ تنقید کوئی آسان کام نہیں۔ نقاد کو بہت سے علوم و فنون پر عبور کامل ہونا چاہئے خصوصاً وہ جس صنف شعر و ادب پر قلم اٹھا رہا ہے اس سے متعلق ہمہ پہلو اور ہمہ جہت علمی ذخیرہ اس کے دامان علم میں ہونا چاہیے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں

کہ وہ جس صنف شعر و ادب پر تنقید اور تحقیق کر رہا ہے اس سے وہ تخلیقی سطح پر بھی نہ صرف آشنا ہو بلکہ اس بحر زخار کا شناور بھی ہو۔ المختصر اسے کامل دستگاہ حاصل ہو تا کہ وہ استدلال اور حوالے کے ساتھ بات کر سکے اور شعور اور بصیرت کا اتنا بہرہ وافر اس کے پاس ہو کہ وہ اعتماد اور خود اعتباری کے ساتھ رائے قائم کر سکے اور محاکے کے جادہ نازک سے سلامت روی کے ساتھ گزر سکے۔ نقاد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صاحب عدل ہو کسی طرفداری اور کسی گروبندی کا شکار نہ ہو جذباتیت سے مغلوب نہ ہو اس کی سوچ اور اس کا اظہار دونوں اس کی عالی ظرفی بلند حوصلگی صبر اور قوت برداشت کے غماز ہوں۔ منصب نقد اصل میں منصب عدل ہے اور اس کے لئے اہلیت کی شرائط اور نقد و نظر کے ضوابط سے گریز نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں میں خود ہی اس بات کی وضاحت کر دوں کہ جس طرح ہر شاعر جذب نعت گوئی کی فراوانی اور اضطراب شوق کے باوجود اعلیٰ درجے کا نعت گو نہیں ہو سکتا اسی طرح نقد و نظر کا ہر مدعی بھی ایک معتبر نقاد نہیں بن سکتا۔ یقیناً خواہش عدل کسی بھی شخص میں ہو سکتی ہے لیکن محض اس خواہش کی بنا پر اسے منصب عدالت پر فائز نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ وہ عدل کی اہلیت کے ساتھ ساتھ عدل کے علم اور اس علم کے اسرار و رموز سے آشنا نہ ہو۔ ہم کسی شخص سے یہ توقع باندھیں کہ وہ کسی غزل پر تنقید کرے اور اس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ شعر کو صحیح تقطیع کے ساتھ پڑھ بھی نہ سکے جبکہ نقد غزل کے لئے اساس یہ ہونی چاہئے کہ وہ تخلیقی سطح پر خود اچھا غزل گو ہو۔ اس کے علاوہ وہ غزل کے بارے میں جامعیت کے ساتھ بہت سا علم رکھتا ہو۔ غزل کیا ہے اس کے موضوعات اور مضامین کیا کیا ہیں اس کے فنی حدود و قیود کیا ہیں غزل اپنی ابتدا سے چل کر ارتقا کے کتنے مراحل طے کر چکی ہے کن کن تحریکات اور دبستانوں سے کیا کیا اثرات اس نے قبول کئے ہیں۔ قدیم اور متوسط زمانوں نیز عصر گزراں میں اس کا رنگ ڈھنگ کیا کیا رہا ہے ہمارے سائنسی دور اور نئے علمی اکتشافات سے اس نے کیا کچھ جذب کیا ہے وہ مختلف ادوار میں کن کن مسائل و افکار کی آئینہ دار رہی ہے۔ غزل اور زبان و بیان کے تحولات و تغیرات صنائع بدائع عروض بیان اور بلاغت کے کن کن پہلوؤں کا ظہور اس سے ہوا ہے۔ اسی غزل کا ایک اور متوازی مطالعہ یہ ہے کہ مختلف زبانوں سے اس کے اخذ و اثر اور جذب و انجذاب اور تاثر و تاثیر کی کیا کیا صورتیں سامنے آئی ہیں۔ غزل کے ناقد کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ اسے بے شمار شعرائے قدیم و جدید کے موضوعات و اسالیب کے ساتھ ساتھ ان کے بے شمار اشعار کا بھی درک ہو۔ تب اتنی بہت سی علم آشنائی کے ساتھ اور شعور و بصیرت سے آراستہ ہو کر وہ غزل پر معتبر اور لائق استفادہ تنقید کر سکتا ہے۔ یہ ایک معمولی سی مثال میں نے عرض کی ہے جس سے مدعا

محض اتنا ہے کہ تنقید کا منصب اور اس کی ذمہ داریاں بہت نازک اور اہم ہیں۔ میں یہاں یہ بھی وضاحت کرتا چلوں کہ میں کسی کی آزادیٔ رائے کو سلب کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ بے شک ایک عام سطح کا آدمی بھی کوئی غزل سن کر یا کوئی افسانہ پڑھ کر اپنی ایک رائے قائم کرسکتا ہے لیکن تاثراتی رائے اور نقد ونظر میں جو امتیاز ہے اس سے صرفِ نظر ممکن نہیں ہے۔ آج کل ہم دیکھتے ہیں اور اکثر نگاہ عبرت سے یہ مناظر دیکھتے ہیں کہ کسی بھی تصنیف پر کوئی بھی شخص تقریظ یا دیباچہ لکھ مارتا ہے اور لطف یہ کہ ہم اس تقریظ نگار یا دیباچہ نویس سے متعارف ہوتے ہی نہیں۔ اس لئے کہ وہ گمنام ہیں اور اس نے ادب کی ایک سطر بھی تخلیق نہیں کی لیکن خیر سے اس نے تنقیدی مضمون لکھ لیا۔ اب اس تنقیدی مضمون کو پڑھئے تو اس میں اتنی بے معنویت' لایعنیت' تناقض اور تضاد حتیٰ کہ جملہ سازی کی اغلاط ہوتی ہیں کہ توبہ الامان الحفیظ!

چشم بددور ہمارے ملک میں ایسے نقادوں کی کھیپ کی کھیپ موجود ہے جنہوں نے اپنی پوری زندگی میں نہ ایک شعر کہا' نہ ایک نثری جملہ تخلیق کیا لیکن تنقید لکھے جارہے ہیں اور برہنائے بے علمی جو کچھ ذہن میں آیا' کاغذ پر گھسیٹ رہے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ گویا ان کے ہاتھ میں ایک ''جج'' کا قلم ہے۔ مصنف ان کے روبرو بطور ملزم حاضر ہے۔ اب یہ اپنے ''محاکمے'' یعنی قطعی فیصلے کی رو سے یا تو اسے مصنف ہونے کی سزا کا حکم سنادیں یا باعزت بری کردیں۔ آپ وطن عزیز میں آئے دن ہزاروں کتابیں چھپتے دیکھتے ہیں اور ان کے آغاز میں ایک دیباچہ یا تنقیدی مضمون بھی ملاحظہ فرماتے ہیں۔ بعض تنقیدی مضامین تو ایسے ہوتے ہیں کہ ایک ہی مضمون ذرا سے نام یا جملوں کے ردوبدل کے ساتھ کئی ایک کتاب نویسوں پر چسپاں کردیا جاتا ہے جیسے کوئی شاعر ایک سہرا لکھ کر صرف ناموں کے ادل بدل کے ساتھ اس سے آٹھ دس سہرے گھڑ لیتا ہے۔

جب عام اصناف ادب میں تنقید کے لئے اہلیت اور شرائط ولوازم کی سخت قید ہے تو نعت ایسی صنفِ افضل واشرف میں نقاد کے معیار ومنزلت کے بارے میں آپ کی توقعات کیا ہونی چاہئیں؟

نقاد کو کبھی یہ طے نہیں کرنا چاہیے کہ جو کچھ اس نے لکھ دیا ہے وہ قطعی ہے' حرف آخر ہے' قول فیصل ہے' عدالتی فیصلہ ہے۔ ادب میں رائے ہوتی ہے' محاکمہ نہیں۔ یہ رائے جتنی وقیع' بامعنی اور معیاری ہو اچھا ہے۔ لیکن نقاد کی رائے میں کوئی جھول اور خامی بھی ہوسکتی ہے اس لئے اس کی تنقید پر کوئی ردعمل ہو اور کوئی اختلافی رائے سامنے آئے تو اسے عالی ظرفی کے ساتھ قبول کرکے اپنی رائے پر نظرثانی کرلینی چاہئے۔

ناقد نعت کو چند امور ذہن میں رکھنے اور انہیں بروئے کار لانا چاہئے:-

(۱) تنقید کرتے وقت جذباتیت اور غصے جیسی کیفیت پر قابو پانا چاہئے۔ اگر وہ کسی نعت گو کے یہاں کوئی (واقعی) خامی پائے تو اسے بے علم، بے خبر، گمراہ، کج رو جیسے القاب سے نہ نوازے۔ اسی طرح اسے وعید سے بھی باز رہنا چاہئے۔ خدا رحیم و کریم ہے اور عفو و درگزر اس کی صفت ہے۔ ہم وعید سناتے رہ جائیں اور وہاں سے پروانہ بخشش جاری ہو جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۲) خامی اور خطا کی نشان دہی پر کسی کی نیک نیتی (اخلاص نیت) کو ہدف نہیں بنانا چاہئے اور ہرگز شبہ وارد نہیں کرنا چاہئے۔ کون ایسا مردود و مغضوب و بد بخت ہوگا جو حضورﷺ کا کلمہ بھی پڑھے، ان کی مدح و ثنا بھی کہے اور اس کی نیت میں فتور بھی ہو، وہ دانستہ ایسے مضمون باندھے جس میں کسر شان اور استخفاف ہو۔ خلوص نیت کے باوجود کوئی فکری سہو یا قلمی لغزش ہو جائے تو ایسا شاعر لائق نفرت نہیں بلکہ راہ نمائی اور ہمدردانہ ہدایت کا ضرورت مند ہے۔ ناقد کو چاہئے کہ اس پر کفر و شرک کا فتویٰ صادر کرنے کی بجائے اس کی علمی راہ بری کرے۔

(۳) اپنی تنقید کی گرم بازاری کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ ناقد کئی نعتیہ تصانیف و ذخائر کا ڈھیر لگائے، آستینیں چڑھالے اور قلم کو نشتر بنا کر نیش زنی کا عزم کرلے اور یہ طے کرلے کہ مجھے عیب شماری اور خطا بینی کے فیلڈ کا چیمپین بننا ہے بلکہ اگر کوئی نعت گو خود سے چاہے کہ اس کے کلام پر رائے زنی کر دی جائے تا کہ اسے اصلاح کی روشنی حاصل ہو، تب یہ اخلاقی فریضہ ادا کرنا زیادہ موزوں ہوگا۔

(۴) تنقید اور خصوصاً نعت پر تنقید کے رویے کے بارے میں ایک امر کے اختیار پر میں ضرور ناقدین سے اصرار کروں گا کہ وہ ''مرحومین'' کو زیر تنقید لانے سے عموماً اجتناب فرمائیں۔ دنیا سے جانے والے اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو چکے ہیں۔ وہ جانیں، ان کا رب جانے۔ پھر اب وہ اس مقام پر ہیں کہ ناقد کی عیب نمائی، خطا جوئی اور اغلاط کی نشان دہی پر اپنی اصلاح نہیں کر سکتے۔ اگر تنقید کے سیاق میں ان کا حوالہ لازمی ہی نظر آئے تو ''احترام رفتگاں'' کے جذبے کے ساتھ نہایت ہلکے پھلکے انداز میں ان پر رائے زنی کرنی چاہئے۔

اکثر مرحومین نے یثرب کا لفظ بے تکلفانہ استعمال کیا ہے یا عربی اور فارسی میں ضمیر واحد حاضر یا واحد غائب کا اتباع کرتے ہوئے اردو نعت میں بھی یہی ضمیر استعمال کی ہے یا کہیں کہیں غلو اختیار کیا ہے۔ دنیا سے گزرنے والے اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ہاں جو ہمارے درمیان ہیں ان کی نعتوں پر فنی شرائط اور اخلاقی ضوابط کے ساتھ رائے کے اظہار میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

(۵) غلو کی بات چلی ہے تو یہاں ایک اور نکتہ سمجھ لینا چاہئے۔ اللہ کی صفات کا پرتو بندگان الٰہی اور

خصوصاً عبادِ خاص (خاصانِ خدا) پر ہوتا ہے۔ خدا رحیم و کریم ہے' رحم و کرم کی صفت بندوں میں بھی ہوتی ہے۔ خدا رؤف ہے' جواد ہے' خطائیں بخشنے والا ہے' عدل اور فضل اس کی صفات ہیں۔ بندوں میں بھی رافت و رحمت' جود و سخا' خطاپوشی اور انصاف پسندی کے اوصاف موجود ہیں۔ جو بندہ جس مرتبہ خلق پر ہوگا اس کے اخلاق میں اتنا ہی علو اور رفعت ہوگی۔ انبیا و مرسلین علیہم السلام تو بے شمار صفاتِ الٰہیہ اور اخلاقِ خداوندی کے پرتو سے خصوصاً عکس پذیر اور متصف ہوتے ہیں۔ اس لئے نعت و ثنائے رسول ﷺ میں جب نعت گو نبی علیہ السلام کی وصف نگاری کرتا ہے تو بعض ناقدین اسے غلو قرار دے کر یہ ادبی فتوی دے ڈالتے ہیں کہ نعت نگار بے احتیاطی سے الٰہی حدود میں دخیل ہوگیا ہے۔ مثلاً استعانت کا مضمون ہے۔ ایاک نعبد وایاک نستعین' کی آیت بینہ میں استعانت باللہ' کا حکم واضح ہے لیکن یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اعانت و نصرت کے سلسلے میں جو خدا کی حدود اختیارات ہیں (اور ان کی کوئی انتہا نہیں) ان میں کوئی نبی مداخلت نہیں کرسکتا۔ لیکن اعانت طلبی میں جو انسانی محدود اختیارات ہیں' ان کے پیش نظر ہم نعت میں ایسا مضمون کیوں نہیں لاسکتے جس کے وسیلے سے ہم اپنے نبی ﷺ سے کچھ طلب کریں۔ اسے یوں سمجھنا چاہئے کہ شفائے کامل عطا کرنے والی ذات اس حکیم حاذق کی ہے جسے اللہ کہتے ہیں لیکن ہم امراضِ امت کے حوالے سے اگر نبی امت سے درماں طلبی کریں تو اس میں استخفافِ الٰہی کی کون سی صورت نکلتی ہے؟

اقبال کہتے ہیں۔

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر

یہاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو چارہ ساز کہہ کر پکارنے سے اللہ کے شافی مطلق ہونے کی نفی کیسے ہو جاتی ہے؟ یا "نگاہے یارسول اللہ نگاہے" کہہ کر اقبال جو اپنے نبی ﷺ کی چشم التفات سے نگاہِ کرم کا طالب ہے' خدا کی نگاہِ کرم سے کیسے بے نیاز ہوگیا؟

نتیجہ کلام یہ ہے کہ اگر ناقدان مبادیات و امور کو نظر میں رکھے تو وہ "استخفافِ الٰہی" کا حکم ہر مقام پر صادر نہیں کرسکتا۔

نغمہ زیدی

اقبال کا قرآنی تصورِ ابلیس ☆

(دیگر نظریات کے تناظر میں)

موجودہ زمانے میں سائنس نے بھی بہت سے حقائق دریافت کیے ہیں اور سائنس کی ایک شاخ مابعد الحیاتیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جنات کی تخلیق گرم ہوا اور فلورین گیس سے ہوئی ہے۔ عام ہوا اور نار سموم میں فرق یہ ہے کہ ہوا میں حدت تابکاری اثرات اور دھواں وغیرہ شامل ہیں جبکہ نار سموم خالص گیس (مرکب نہیں مفرد ہے) خلا میں موجود ہے۔ نار سموم ایکسرے کی لہروں کی طرح ٹھوس اجسام میں سے گزرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ چنانچہ جنات کے تخلیقی اجزاء میں نار سموم کی وجہ سے ٹھوس اجسام میں سے گزرنے اور نہ دکھائی دینے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اسٹیفن ایچ ڈول اور کارل میکان ''نوبل انعام یافتہ سائنسدان'' جو تحقیقات میں مصروف ہیں۔ لکھتے ہیں کہ کائنات میں ایسی مخلوق کا پایا جانا ممکن ہے جو ہماری طرح غذا کے محتاج نہ ہوں۔ جب کسی کو غذا کی ضرورت نہ ہوگی تو اس کے جسم میں نظام ہاضم بھی نہ ہوگا اور جسم نہ تو وزن رکھے گا اور نہ ہی شکل، اس کا جسم اتنا لطیف ہوگا کہ جب چاہے شکل بدل لے اور جب چاہے نظروں سے غائب ہو جائے''۔

ان میں سے ایک ''ابلیس'' بھی ہے۔ جان کی اولاد جوڑا جوڑا پیدا ہوتی رہی۔ اس طرح نوے ہزار جوڑے پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد اس قدر بڑھے کہ ذرہ ہائے ریگ زار کے برابر ہو گئے''۔

☆ خزینۃ العلوم قرآن حکیم کی سورت ''الرّحمٰن'' کی آیت نمبر ۱۵ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''خلق الجانّ من مّارجٍ مّن نّارٍ ○ ترجمہ: یعنی اللہ تعالیٰ نے جنوں کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔

اسی طرح سورۃ الحجرات آیات (۲۶۔۲۷) میں فرمایا گیا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُومِ ()

ترجمہ: اور بے شک ہم ہی نے آدمی کو سڑی مٹی سے جو کھ کھن کھن بولنے لگے پیدا کیا اور ہم ہی نے جنات کو آدمی سے پہلے بے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا ہے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ کے قول کے مطابق خداوند تعالیٰ نے نار سموم کو پیدا کیا جس میں نہ گرمی تھی اور نہ دھواں تھا۔ پس اس سے جان کو پیدا کیا اور ان کا نام ''مارج'' رکھا پھر اس سے اس کی مونث کو پیدا کیا جس کا نام مارجہ رکھا۔ اور ان دونوں سے جان کو پیدا فرمایا اور جان کے بیٹے کا نام ''جن'' ہوا۔ اور اس سے جنوں کے تمام قبائل پیدا ہوئے۔

ایک اور مشہور سائنس دان ڈاکٹر ہیرلڈ ارے اپنی کتاب ''دی کیمیکل ورلڈ'' میں لکھتا ہے کہ اگر ہم سلیکون کے عنصر سے ایسی مخلوق بنائیں جس میں سلفر اور فلورین گیس شامل ہوں تو وہ اپنی شکل مسلسل بدلتی رہے گی۔ اور اس کا پسندیدہ مقام ستارہ زہرہ یا مشتری ہوسکتا ہے جہاں سے وہ براہ راست سورج سے حرارت حاصل کرسکتے ہیں۔ دوسرے روحانی ماہر سائنس دان ڈاکٹر سرلاج' ڈاکٹر سر جیمس اور پروفیسر جوڈ اس بات پر متفق ہیں کہ نظام شمسی کے کسی سیارے سے کوئی مخلوق زمین پر آکر اپنے خصوصی کارندوں پر اثرانداز ہوتی ہے اور انہیں اپنا تابع بنا کر عقل سے بعید حرکات سرزد کراتی ہے۔ گویا جنات مجرد روح نہیں ہیں بلکہ ایک خاص نوعیت کے مادی اجسام ہی ہیں' جنہیں انسان دیکھ نہیں سکتے۔

قرآن پاک نے صراحت کردی ہے کہ ''ابلیس'' کسی مجرد قوت کا نام نہیں بلکہ وہ بھی انسان کی طرح ایک صاحب تشخص ہستی ہے۔ اور وہ جنوں میں سے تھا۔ ملعون ہونے سے قبل اس کا نام ''عزازیل'' تھا۔ عزازیل عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ یہ کلمہ قرآن مجید میں گیارہ بار آیا ہے۔ اس لفظ کے مشتق یا غیر مشتق ہونے کے ضمن میں کئی بحثیں موجود ہیں۔ مگر پروفیسر آرتھر جیفری (Arthur-Jeffery) کی یہ رائے وزنی معلوم ہوتی ہے کہ یہ کلمہ یونانی لفظ کی تحریف سے معرب کیا گیا ہے۔ یعنی عبرانی اور سریانی زبانوں میں پہلے "d" کو حذف کرلیا گیا ہے۔ اور اسی لفظ کو تحریف سے معرب بنالیا گیا ہے۔ "diabolos" کے معنی یونانی زبان میں دروغ گو اور فتنہ پرداز کے ہیں۔ پروفیسر موصوف ''شیطان'' کا مادہ اور اصل حبشی زبان کا لفظ ''شیط'' بتاتے ہیں۔ اس طرح ''شیطان'' کے معنی ''ارواح خبیثہ کے حاکم'' ہوتے ہیں۔

دنیا کے تمام مذاہب میں مظاہر شر مذکور ہیں۔ بدھ مت میں مارا' زرتشتی یا مانوی مذہب میں تاریکی اور اہرمن' یہودیت' مسیحیت اور اسلام میں ابلیس ہے۔

زرتشت کے نظریات کے متعلق ''اقبال'' نے اپنے مقالے ''فلسفۂ عجم'' میں لکھا ہے۔

> ''جب ہم اس کی کونیات پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ اپنی ثنویت کی رہنمائی میں کل کائنات کو دو شعبوں میں تقسیم کردیتا ہے۔ حقیقت یعنی عام مخلوقات صالح کا مجموعہ جو ایک ایسی روح کی تخلیقی فعلیت ہے جو رحیم و کریم ہے۔ غیر حقیقت یعنی تمام مخلوقات خبیثہ کا مجموعہ جو اس کے متخالف روح کی پیداوار ہے۔ ان دونوں روحوں کی ابتدائی پیکار فطرت کی متخالف قوتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس لئے خیر و شر کی قوتوں کے مابین ایک مسلسل

پیکار جاری ہے"۔

مانی کو زرتشت کے بعد ایران کا سب سے اہم مفکر مانا گیا ہے۔عیسائیوں نے اسے "بے دین فرقہ کا موجد" کا لقب دیا ہے۔اقبال نے اپنے مذکورہ بالا مقالہ میں "مانی" کے خیر وشر اور نور وظلمت کے تصادم کے نظریے کا بھی ذکر کیا ہے جس کا مشرق ومغرب کے فلسفیوں کے افکار اور بالخصوص تصور ابلیس پر خاصا گہرا اثر ہے۔مانی کے متعلق علامہ اقبال لکھتے ہیں۔

"اس صوفی ملحد نے یہ تعلیم دی ہے کہ اشیاء کی یہ کثرت، گونا گونی، نور وظلمت کی ان ازلی قوتوں کے اتصال سے ظہور میں آئی ہے جو ایک دوسرے سے علیحدہ اور آزاد ہیں۔نور کی قوت دس قسم کے تصورات کی متضمن ہے۔شرافت، علم، فہم، اسرار، بصیرت، محبت، یقین، رحم، حکمت اور عمل۔اسی طرح ظلمت بھی پانچ ازلی تصورات کی متضمن ہے۔تاریکی، حرارت، آتش، حدت، ظلمت۔مانی تسلیم کرتا ہے کہ ان اساسی قوتوں کے ساتھ ساتھ اور ان سے ملحق ارض ومکاں ازل سے موجود ہیں۔اور ان میں سے ہر ایک علی الترتیب علم، فہم، اسرار، بصیرت، سانس، ہوا، پانی، روشنی اور آتش کے تصورات کو متضمن ہے۔ظلمت میں جو کہ فطرت کی نسائی قوت ہے، شر کے عناصر پوشیدہ تھے اور یہ رفتہ رفتہ مرتکز ہو گئے۔اسی سے وہ قبیح صورت والا شیطان وجود میں آیا۔جس کو قوت فعلیت سے موسوم کرتے ہیں"۔

مزدک کی ثنویت بھی مانی کی ثنویت کی مانند ہے۔مگر ایک معمولی اختلاف کے ساتھ اس بارے میں "اقبال" نے لکھا ہے۔

"مانی کی طرح مزدک نے بھی تعلیم دی کہ اشیاء کا اختلاف وتنوع دو مستقل وازلی قوتوں کے امتزاج واتحاد کا نتیجہ ہے۔جس کو اس نے شد (نور) اور تار (ظلمت) کے ناموں سے موسوم کیا ہے لیکن وہ اپنے پیشرو سے اس امر میں اختلاف رکھتا ہے کہ ان کے اتحاد اور ان کے آخری انفصال کے واقعات بالکل اتفاقی تھے نہ کہ کسی امتیاز وانتخاب کا نتیجہ"۔

مسلمان صوفیاء میں سے جنہوں نے ابلیس کا خاص طور پر ذکر کیا ہے ان میں منصور بن حلاج، مولانا

روم، شیخ محی الدین ابن عربی اور عبدالکریم جبلی زیادہ اہم ہیں۔

منصور بن حلاج نے اپنی کتاب ''الطواسین'' میں ابلیس کو ایک ایسا کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ جس کے فرائض سب سے زیادہ تلخ، ناگوار اور نازک ہیں۔ وہ خدا کے ارادوں اور مشیت کا وہ کارندہ ہے جو اہل ملامت میں شامل ہے۔ ان کے نزدیک ابلیس ایک ناگزیر ہستی ہے''۔

ابن عربی بھی ابلیس کی آزادیٔ مادہ کے قائل ہیں۔ چنانچہ ضرب کلیم میں ''تقدیر'' کے عنوان سے جو نظم شامل ہے، وہ ابن عربی کے افکار سے ماخوذ ہے۔ عبدالکریم جبلی نے بھی ابن عربی کے افکار سے فائدہ اٹھایا ہے۔ عزیز احمد اس سلسلہ میں اپنی کتاب ''اقبال نئی تشکیل'' میں لکھتے ہیں:

> ''عبدالکریم جبلی نے جن کی شمع بڑی حد تک ابن عربی کے تفکر سے جلی ہے۔ شیطان کے مسئلہ پر بحث کی ہے۔ یہاں تضاد اور اصلی لڑائی انسان اور شیطان کی حقیقت ناریہ اور حقیقت خاکیہ میں ہے نہ کہ اہرمن اور یزداں میں۔ اہرمن اور یزداں کے تصور کو ذاتِ حق میں تحلیل سمجھا گیا ہے، جو جامع ضدین ہے''۔

مغربی شعراء میں جان ملٹن اور گوئٹے نے بھی ابلیس کو موضوع بحث بنایا ہے۔ جان ڈینسین ملٹن کی مشہور زمانہ نظم ''فردوس گم گشتہ'' "Paradise lost" میں جو انسان کے زوال کی داستان ہے۔ ابلیس ہمیں محض ایک علامت شر ہی کے طور پر نہیں بلکہ علامت حرکت و عمل کے طور پر نظر آتا ہے۔ اس نظم میں خدا، فرشتے اور حضرت عیسیٰ کے کردار پھیکے اور بے جان بنا کر پیش کیے گئے ہیں۔ ملٹن کا شیطان گو جسمانی طور پر خدا سے کمتر ہے مگر فراست وزیرکی میں اپنے آپ کو خدا کا ہمسر گردانتا ہے۔ (Whom Reason Equalled) وہ صرف خدا کو ہی مقابل تصور کرتا ہے۔ وہ بڑی خوبصورتی سے کہتا ہے کہ بہترین کا مقابلہ بہترین سے ہوگا۔ میں خالق سے مقابلہ کروں گا، مخلوق سے میرا کوئی مقابلہ نہیں۔ اسے جنت کی غلامی کے بجائے دوزخ کی حکمرانی زیادہ پسند ہے۔ اسی لیے اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر بیداری کا پیغام دیتا ہے کہ بھاگو، اٹھو ورنہ ہمیشہ کے لیے ذلیل ہو جاؤ گے''۔

گویا ملٹن کے نزدیک شیطان حرکت و عمل، جذبہ و جوش، انتقام و حسد، فراست و فہم، حوصلہ و ہمت، جرات و خودداری، رزالت اور کمینگی کا پیکر نظر آتا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم ''فکرِ اقبال'' میں لکھتے ہیں۔

> ''مشرق و مغرب میں بعض اکابر، صوفیا، حکماء اور شعراء نے ابلیس کو المیہ کا ایک

زبردست کردار بنا دیا۔ ملٹن کے ''فردوس گم گشتہ'' کی دینی نظم میں شیطان ایک ایسا کردار ہے جس کی تشکیل میں ملٹن نے اپنی قوت تخیل کو پورے زوروں کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ گوئٹے کے حکیمانہ ڈرامے ''فاؤسٹ'' میں زندگی کے گہرے اسرار اور اس کی باطنی قوتوں کی گرہ کشائی کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ڈرامے کا محور بھی فاؤسٹ کے علاوہ ابلیس ہی ہے۔ اقبال جو ملٹن اور گوئٹے کا ہم پایہ اور روحانی بصیرت والا مفکر شاعر ہے۔ اس نے بھی ابلیس کی حقیقت کوئی جگہ بیان کر کے اس تصور کو ایک نئے رنگ میں پیش کیا ہے۔ اقبال کے یہاں ابلیس کا تصور اس کے فلسفۂ خودی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ خودی کی ماہیت میں ذات الٰہی سے فراق اور سعی، قرب و وصل دونوں داخل ہیں۔ اقبال کے فلسفۂ خودی کی جان اس کا نظریہ عشق ہے اور عشق کی ماہیت آرزو، جستجو اور اضطراب ہے''۔

گوئٹے کے نزدیک یہ کائنات کسی اعلیٰ مقصد کیلئے تخلیق کی گئی ہے۔ اور زندگی فرد کی امکانی نشوونما کی ایک شکل ہے۔ فاؤسٹ میں یہی مسئلہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعے گوئٹے اپنے معاصرین اور آئندہ نسلوں کو امید کا نیا پیغام دینا چاہتا ہے۔

گوئٹے کا میفسٹو اور اقبال کا ابلیس آدم کے سامنے عملِ پیہم کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ابلیس کی ملاقات سے پہلے حضرت آدم کی زندگی بالکل بے عملی اور جمود کی زندگی تھی۔ گوئٹے کے نزدیک ابلیس اس طاقت کا حصہ ہے جو زندگی کی خوشیوں کو افشا کرتی ہے۔ آدم اور شیطان دونوں کا اکٹھا رہنا ضروری ہے۔ اگر ان کی دوستی ختم ہو جائے تو ''خیر'' کا خاتمہ ہو جائے۔ فاؤسٹ ابلیس سے ملاقات کے بعد زندگی کی اعلیٰ صفات پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ابلیس ایک نئی دنیا کا ویژن دیتا ہے۔ گویا بقا کا راز لامتناہی جدوجہد میں ہے۔

اسی طرح ''دانتے'' کی ''ڈیوائن کامیڈی'' میں ابلیس ایک جامد، غیر متحرک، بدصورت و مکروہ شخصیت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ وہ جہنم کے مرکز میں کمر تک برف میں دھنسا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی مرکز کی طرف معصیت کے تمام دریا ادھر ادھر بہہ کر آتے ہیں اور وہ جب اس صورت حال سے نجات پانے کے لیے اپنے بڑے بڑے پر پھڑپھڑاتا ہے تو اس پھڑپھڑاہٹ سے ہوا کے جھونکے برف کی برودت کو نقطۂ انجماد سے اور نیچے لے جاتے ہیں۔ اور نتیجتہً ابلیس برف میں اور زیادہ دھنستا چلا جاتا ہے۔

یہ دانتے کا اپنا تصور ابلیس ہے۔ جس سے اقبال کا تصور ابلیس بہت ہی مختلف ہے۔ اقبال کا ابلیس صرف مرکز شر ہی نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اقبال کا ابلیس ایک باعمل شخصیت ہے۔ جو قوت محرکہ سے لبریز ہے۔ یہ برف میں دھنسا ہوا بدی کا مجسمہ نہیں' بلکہ سراپا شعلہ ہے۔ شعلہ جو روشنی' گرمی اور حرکت کی علامت ہے۔

اقبال نے ابلیس کے قرآنی تصور کو پورے طور پر پیش نظر رکھا اور پھر اس سے دیگر نتائج اخذ کیے۔ قرآن پاک کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) ابلیس نے تخلیق آدم کے وقت دوسرے ملائک کی مانند اسے سجدہ نہیں کیا۔ خدائے تعالیٰ کے دستور کے مقابلے میں اپنی برتری اور زعم میں نہ جھکا اور کہا ''میں ناری ہو کر خاکی کو سجدۂ تعظیمی نہیں کر سکتا''

(۲) نافرمانی کی بنا پر خدا نے اسے راندۂ درگاہ قرار دیا اور دربار سے نکال دیا۔

(۳) ابلیس آدم کا دشمن اول بن کر خلق خداوندی کو گمراہ کر رہا ہے۔ جوش انتقام میں اس نے پہلے آدم و حوا کو بہشت سے نکلوایا اور پھر اولاد آدمؑ کی گمراہی کے درپے ہو گیا۔

(۴) ابلیس و شیاطین کو پوری قوت کے ساتھ سرگرم رہنے کی مہلت میسر ہے۔ وہ اس مہلت سے استفادہ کرتے ہوئے لوگوں کے ایمانوں پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں۔ ابلیس نظام کائنات میں موجود ہے۔ اور شیاطین نے ایک دوسرے سے وحی کا سلسلہ بھی قائم کر رکھا ہے۔ البتہ خدا کے خاص بندوں سے تعارض کرنا شیطان کی قوتوں سے بالاتر ہے۔

(۵) مومنوں کو چاہیے کہ ہمیشہ ذکر و فکر اور استقامت باللہ سے ہمکنار ہوں اور شیطانی قوتوں سے نبرد آزما رہیں۔

اقبال نے اپنے کلام میں ابلیس کا ہمہ جہت تصور پیش کیا ہے۔ اس کے کئی روپ اور کئی اسلوب ہیں۔ کبھی وہ تخلیق انسان کے آفاقی ڈرامے کا بدنصیب ہیرو نظر آتا ہے جس میں بدی کا عنصر غالب ہے۔ یہی بدی انسانی فطرت کا جزو لاینفک بھی ہے۔ یہی بدی حرکت و عمل پر بھی اکساتی ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین کا کہنا ہے۔

> ''شیطان اصل میں عشرت حیات اور قوت کی روح کا جزو ہے اور روح ارضی کا مددگار۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کے دل میں عمل کا ولولہ پیدا کرے۔ مگر چونکہ اس کی خلقت ناقص ہے اس لیے وہ اعتدال سے گزر جاتا ہے''۔

علامہ اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں تین مقامات پر ابلیس و شیطان کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے۔ ایک مقام ''فلکِ قمر'' ہے جہاں اہرمن زرتشت کو نبوت کے خلاف دلائل دیتا ہے۔ اور اس منصب کے مقابلے میں ''ولایت'' کے حق میں براہین پیش کرتا ہے۔ مگر زرتشت منصب نبوت کا دفاع کرتا ہے۔ دوسرا مقام ''فلکِ مشتری'' ہے جہاں اقبال (زندہ رود) خواجۂ اہل فراق ابلیس سے ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں۔

ناگہاں دیدم جہاں تاریک شُد — از مکاں تا لامکاں تاریک شُد
اندراں شب شعلۂ آمد پدید — از درونش پیر مردے بر جہید
یک قبائے سرمئی اندر برش — غرق اندر دود پیچاں پیکرش
گفت رومی خواجۂ اہل فراق — آں سراپا سوز و آں خونیں ایاق

یعنی ابلیس سراسر تاریکی ہے۔ اس کی آمد پر چاروں طرف اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور وہ ایک دُود آلود شعلہ سے نمودار ہوتا ہے اور آخر اسی میں روپوش ہو جاتا ہے۔ اپنے انکار کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ اس سے انسانوں کو ''ذوق ترک و اختیار'' اور ''لذتِ فراق'' مل گیا ہے۔ اسی طرح ''جاوید نامہ'' کے فلکِ عطارد پر اقبال سید جمال الدین افغانی کی زبان سے فرماتے ہیں۔

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است — زانکہ او گم اندر اعماق دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی — کشتۂ شمشیر قرآنش کنی

''نالۂ ابلیس'' جاوید نامہ کی مشہور نظم ہے۔ فرماتے ہیں:

ہیچ گہ از حکم من سر بر نتافت — چشم از خود بست و خود را در نیافت
خاکش از ذوقِ ''ابا'' بیگانۂ — از شرارِ کبریا بیگانۂ
صید خود صیاد را گوید بگیر — الاماں از بندۂ فرماں پذیر
از چنیں صیدے مرا آزاد کن — طاعت دیروزۂ من یاد کن
پست از واں ہمت والائے من — وائے من اے وائے من اے وائے من
فطرت او خام و عزم او ضعیف — تاب یک ضربم نیارد ایں حریف
بندۂ صاحب نظر باید مرا — یک حریف پختہ تر باید مرا

ابلیس خدا کے حضور محوِ فغاں ہے۔ وہ انسان سے اس لیے خفا ہے کہ وہ اس کے مقابلے کا اہل نہیں اور چاہتا ہے کہ اس صید زبوں سے اسے نجات مل جائے جو خود بخود اس کے پھندے میں چلا آتا ہے۔ اس کم

ہمت کی صحبت نے اسے خراب کر دیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا مدمقابل ایسا انسان ہو جو اسکی گردن مروڑ سکے اور اسے ذرہ برابر اہمیت نہ دے۔ ایسے مردِ حق پرست سے شکست کھانا بھی لذت آگیں ہوگا۔ اس نظم میں گوئٹے کے شیطان کا عکس موجود ہے جو صرف فاؤسٹ جیسے بلند مرتبہ انسان سے شکست کھاتا ہے۔ ''پیام مشرق'' میں دو نظمیں ''اغوائے آدم'' اور ''انکار ابلیس'' میں بھی علامہ نے ابلیس کے افکار اور مفاخرآمیز اقوال نقل کیے ہیں۔ ''اغوائے آدم'' میں آدم کے ہبوط کی ولولہ انگیز کیفیت نظم کی ہے۔ یاد رہے کہ اقبال آدم کے مسلسل عروج کے قائل ہیں اور ہبوطِ آدم کے واقعہ کو وہ انسان کی بے پناہ ترقیوں کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔

جاوید نامہ میں آں سوئے افلاک کے مقام پر علامہ کی ملاقات میر سید علی ہمدانی اور شاہ ہمدان (۷۱۴۔۷۸۶ھ) سے ہوتی ہے۔ وہ شاہ ہمدان کو ابلیس کی مصلحتوں سے آگاہ کرتے ہیں۔

اقبال ابلیس کو زندگی کی ایک اہم صفت قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح آدم (بحیثیت مجموعی) زندگی کی ایک ارتقائی صورت ہے اسی طرح ابلیس بھی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ ان کے خیال میں آدم جذبات کا نمائندہ ہے اور ابلیس عقل کا۔ اس سلسلے میں وہ رومی سے بھی متاثر نظر آتے ہیں اور ان کا یہ مصرعہ اکثر استعمال کرتے ہیں۔

زیرکی ابلیس و عشق از آدم است

گویا آدم عشق اور روحانیت کا نمائندہ ہے اور ابلیس خشک عقلیت اور مادیت کا۔ اقبال کے بنیادی فلسفے یعنی خودی میں ابلیس کا مقام کافی بلند ہے۔ ان کے تصور ابلیس کے بارے میں خلیفہ عبدالحکیم نے ''فکرِ اقبال'' میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''اقبال کے ہاں ابلیس کا تصور اس کے فلسفۂ خودی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ خودی کی ماہیت میں ذاتِ الٰہی سے فراق اور سعیٔ قرب و وصال دونوں شامل ہیں۔ اقبال کے فلسفۂ خودی کی جان اس کا نظریۂ عشق ہے۔ عشق کی ماہیت آرزو، جستجو اور اضطراب ہے۔ اگر زندگی میں موانع موجود نہ ہوں تو وہ خیر کوشی بھی ختم ہو جائے۔ جس کی بدولت خودی میں بیداری اور استواری پیدا ہوتی ہے۔ اگر انسان کے اندر باطنی کشاکش نہ ہو تو زندگی منجمد ہو کر رہ جائے۔ اقبال نے شیطان کی خودی کو بھی زور و شور سے پیش کیا ہے اور کئی اشعار میں شیطان کی تذلیل کے بجائے اس کی تکریم کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال جدوجہد کا منبع ہے اور جدوجہد باطنی اور خارجی مزاحمتوں کے بغیر نہیں ہو سکتی۔''

''بالِ جبریل'' کی نظم ''جبریل و ابلیس'' میں شیطان اپنی اہمیت کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو
خضر بھی بے دست و پا' الیاس بھی بے دست و پا میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا' جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح تو فقط اللہ ہو' اللہ ہو' اللہ ہو

اس نظم میں شاعر شیطان کو تمام حرکت اور تمام تغیر کی تخلیق کا مدعی قرار دیتا ہے۔ وہ ''سوزِ درونِ کائنات'' ہے۔ کیونکہ زندگی میں فراق کی بنا اس کے انکار نے ہی ڈالی ہے۔ انسان جو محض ایک مشتِ خاک تھا' اس میں بھی ذوقِ نمود پیدا ہوا۔ گویا اقبال کے نزدیک شیطان محض فتنہ و شر کا علامتی پیکر نہیں بلکہ آزادئ خیال' آزادئ رائے اور قوتِ عمل کی تخلیق کا مظہر بھی ہے۔

ضربِ کلیم میں ''تقدیر'' کے عنوان سے ایک نظم ہے جس کا ذیلی عنوان ''ابلیس و یزداں'' ہے۔ اس نظم کا مرکزی خیال ابن عربی سے ماخوذ ہے۔ اور ابلیس و یزداں کے درمیان ایک مکالمے کی صورت میں ہے۔ ابلیس بارگاہ ایزدی میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ اے اللہ تعالیٰ' مجھے آدم سے کوئی بیر نہ تھا اور نہ تیرے سامنے تکبر کرنا میرے لیے ممکن تھا' بات صرف اتنی ہے کہ تیری مشیت یہ تھی کہ میں آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کروں۔ خدا پوچھتا ہے کہ تجھ پر یہ راز انکار سے پہلے کھلا یا بعد میں۔ ابلیس نے جواب دیا۔ بعد میں۔ اس پر خدا فرشتوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

یہاں اقبال نے آزادئ ارادہ کی اہمیت ظاہر کی ہے۔ اللہ نے شیطان کو آزادی اور اختیار بخشا تھا۔ جسے وہ احمق مجبوری اور جبر کا نام دے رہا تھا۔ حالانکہ اس کی تخلیقی فعلیت ہرگز کسی جبر و مشیت کی پابند نہیں ہے۔ اقبال کے خیال میں شیطان نے تقدیر پرستی شاید انسان سے سیکھی ہے۔ اس انسان سے جو خود تقدیر یزداں بننے کی کوشش نہیں کرتا۔

اقبال جو قوت و حیات' خودی اور خود اعتمادی کے پیغامبر ہیں' ایک ایسے انسان کو معاشرے کے لئے

کسی لحاظ سے بھی مفید قرار نہیں دے سکتے جو بے عمل ہو۔ عمل کرو اور اپنی شخصیت کی نمود کے لئے کوشاں رہو۔ یہی اقبال کی پکار ہے۔ شیطان جو رسمی مذہب میں بدی کا پتلا ہے' اسے اقبال اس حیثیت سے پیش کرتے ہیں کہ اس نے جبر و تحکم کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے اور احکام کی بے چون و چرا تعمیل کرنے کی بجائے خود آزادانہ فیصلہ کرنے میں پیش قدمی کی ہے۔ اور اپنے اس اقدام سے وہ زبردست معرکہ چھیڑ دیا جو افراد کے اندرونی رجحانات اور خارجی ماحول کے درمیان ہمیشہ جاری رہے گا۔ خدا کے اس سوال پر کہ وہ آدم کے سامنے سربسجود کیوں نہیں ہوا۔ شیطان کا جواب از روئے قرآن یہ ہے کہ "میں اس سے بہتر ہوں' تو نے مجھے آتش سے پیدا کیا اور آدم کا پتلا خاک سے بنایا ہے"۔

اپنی نظم "تسخیر فطرت" میں اقبال نے اس آیۂ قرآنی کی نہایت موثر ترجمانی کی ہے۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

نوریٔ ناداں نیم سجدہ بہ آدم برم　　　　او بہ نہاد است خاک من بہ نژاد آذرم

یہاں اقبال نے شیطان کو اپنے اندرونی جذبات یعنی جذبۂ مسابقت' دوسروں پر فوقیت حاصل کرنے اور غلبہ پانے کی آرزو کا اظہار کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ ماحول کی قوتوں کے مقابل میں ردعمل' مقاومت اور انہیں متاثر کرنے کی جو فطرت ہر جاندار میں موجود ہے۔ شیطان گویا اسی رجحان کی ایک رمزیہ شکل ہے۔ یہ رجحان زندگی کا جوہر ہے اور تمام آرزو' طلب' سعی و کامرانی کی تخلیق کا ذمہ دار دراصل یہی ہے۔ "تسخیر فطرت" کے آخری بند میں فرماتے ہیں۔

رام نگردد جہاں تانہ فسونش خوریم　　　　جز بکمند نیاز نازنہ گردد اسیر

تا شود از آہ گرم ایں بت سنگیں گداز　　　　بستن زنار او بود مرا ناگزیر

عقل بدام آورد فطرت چالاک را　　　　اہرمن شعلہ زاد سجدہ کند خاک را

اقبال کے نزدیک شیطان آزادیٔ خیال' آزادیٔ رائے اور قوت عمل کی تخلیق کا مظہر ہے۔ انسانی زندگی کی تمام دلچسپیاں آزادی اور بغاوت کے اسی جذبہ کی مرہون منت ہیں۔ جسے شیطان نے تحریک دی اور جس کے بغیر زندگی' زندگی نہ رہ جاتی۔ اقبال کے وہ مبصرین جو انہیں مروجہ مذہبی نظریات کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ شیطان کے بارے میں ان کے نظریات کے اس پہلو سے انصاف برتنے میں قاصر رہے ہیں۔ ایسے حضرات کے نزدیک شیطان محض فتنہ و شر کا ایک علامتی پیکر ہے۔ پس انہیں شیطان کے اندر کوئی قابل ستائش وصف نظر نہیں آتا۔ درانحالیکہ اقبال نے شیطان کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام حرکت

اور تمام تغیر کی تخلیق کا مدعی ہے۔

اقبال کے آخری مجموعۂ کلام ''ارمغان حجاز'' میں ایک نادر الاسلوب نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے عنوان سے ملتی ہے۔ جس میں انہوں نے ایک شیطانی پارلیمنٹ کا نقشہ کھینچا اور دکھایا ہے۔ اس نظم میں شیطان اس عالم مادی پر کامل قبضہ و تصرف اور قلوب انسانی پر لامحدود دائرہ و اقتدار کا دعویٰ کرتا ہے۔ شیطان اور اس کے مشیر ایک مجلس شوریٰ میں جمع ہو کر عالمی مسائل اور مستقبل کے خطرات کا جائزہ لیتے ہیں جو ابلیسی نظام اور شیطانی پروگرام کی راہ میں آنے والے ہیں۔

شیطان کے مشیر اسلامی نظام سے پہلے دوسرے نظام ہائے فکر کا نام لیتے ہیں۔ سب سے پہلے ابلیس حاضرین کو مخاطب کرتا ہے۔

یہ عناصر کا پرانا کھیل! یہ دنیائے دوں	ساکنان عرش اعظم کی تمناؤں کا خوں
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز	جس نے اسکا نام رکھا تھا جہان کاف و نوں
میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب	میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا	میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں
کون کر سکتا ہے اس کی آتش سوزاں کو سرد	جسکے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوز دروں
جسکی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند	کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں

اس تقریر کے بعد پہلا مشیر کہتا ہے کہ ابلیسی نظام کے استحکام میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ اس نے تو شاہ و گدا سب کو جکڑ رکھا ہے۔ عوام غلامی پر راضی ہیں۔ ان کے دل بے ذوق ہیں جن میں کوئی آرزو سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتی۔ شیطان کہتا ہے کہ ہماری مسلسل تگ و دو سے صوفی و ملا جنہیں مسلم عوام کی قیادت حاصل ہے ان کی اکثریت ملوکیت پر راضی ہے۔ مُلا یا عالم دین کا سارا علم و نظر کلامی بحثوں الٰہیات کے مسائل اور مناظروں تک محدود ہے جن کو عوام کی رہنمائی کرنا تھی۔ وہ خود ملوکیت اور باطل حکومتوں کے غلام اور بندۂ بے دام بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کی تیغ بے نیام کند ہو کر رہ گئی اور ان کی نومیدی کا عالم یہ ہے کہ اب گویا حرمت جہاد پر اجماع ہو گیا ہے۔

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام	پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں	ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج		صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
طبعِ مشرق کیلئے موزوں یہی افیون تھی		ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علم کلام
ہے طواف وحج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا		کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام
کس کی نومیدی پہ حجت ہے یہ فرمان جدید

اگر چہ اقبال کا نظریۂ شیطان رسمی عقائد سے مختلف ہے۔ لیکن پھر بھی شیطان جن رجحانات کا مظہر ہے۔ اگر انسان بالکل انہیں رجحانات کا مطیع ہو جائے تو نتیجہ ابدی انتشار و کشمکش اور تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ نکلے گا۔ گویا موجودہ دور میں انسان اقبال کے نزدیک ابلیس کے پھندے میں گرفتار ہے۔ اور خصوصاً مسلمان قوم طاغوتی سحر میں مبتلا ہو کر مادیت پرستی اور حب زر کا شکار ہو رہی ہے۔ مذہب کے ظاہری رسوم باقی ہیں جبکہ اس کی روح ختم ہوتی جاتی ہے۔

اس نظم میں دوسرا مشیر جمہوریت کو سب سے بڑا خطرہ بتاتا ہے۔

خیر ہے سلطانی جمہور کا غوغا کہ شر		تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر

اس پر پہلا مشیر کہتا ہے کہ مجھے تو جمہوریت سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ میں تو اسے ملوکیت ہی کا ایک دل آویز پردہ سمجھتا ہوں۔ گویا موجودہ جمہوری نظام اقبال کے نزدیک ملوکیت ہی ہے۔ میر و وزیر ہی صرف بادشاہی نمائندے نہیں بلکہ اس کی بے شمار صورتیں ہیں۔ مغرب کا جمہوری نظام بھی جور و جبر سے بری نہیں۔ اس کا چہرہ روشن ضرور ہے مگر اس کا باطن چنگیز و ہلاکو سے زیادہ تاریک اور بھیانک ہے۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس		جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خودنگر
کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے		یہ وجود میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو		ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جسکی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام		چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

اس وضاحت اور تسلی کے بعد تیسرا مشیر اطمینان کا سانس لیتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو ملوکیت کی روح باقی رہنے سے بھی کوئی حرج نہیں لیکن اس فتنہ عظیم کا کیا جواب ہے جو اس فتنہ پرداز اور خانہ برانداز یہودی ''کارل مارکس'' کی ایجاد ہے جو نبی نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے کامریڈوں کے نزدیک کسی نبی سے کم نہیں۔ اس کی ذات انقلابی ضرور تھی مگر وہ آسمانی ہدایتوں سے محرومی کے باعث کلیم بے تجلی اور مسیح بے صلیب

بن کر رہ گیا۔ اور دنیا کو کوئی صحیح راہ عمل نہیں دے سکا۔ وہ ہر مذہب کا منکر تھا۔ مگر اس کی کتاب CAPITAL کمیونسٹوں کی نظر میں کسی آسمانی صحیفہ سے فروتر نہیں اور کمیونزم سارے مذاہب کا انکار کرتے ہوئے بھی خود ایک مذہب بن بیٹھا ہے۔ طبقاتی کشمکش پیدا کر کے امیر و غریب بورژوا اور پرولتاری کو ایک دوسرے سے لڑا دیا اور قوموں کے درمیان نفرت و عداوت کا بیج بو دیا ہے۔ پانچواں مشیر ابلیس کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام	اب مجھے انکی فراست پر نہیں ہے اعتبار
وہ یہودی فتنہ گر روح مزدک کا بروز	ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار
زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسر شاہین و چرخ	کتنی سُرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج	کانپتے ہیں کوہسار و سرغزار و جوئبار
میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے	جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

آخر میں ابلیس اپنے مشیروں کو مخاطب کر کے اپنی آخری رائے دیتا اور اپنا پروگرام سب کے سامنے رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ ان تحریکات اور نظریات سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اصل عالمی اقتدار اب بھی مرے پنجۂ اختیار میں ہے۔ دنیا کے ہر اتار چڑھاؤ اور سیاسی اتھل پتھل میں میرا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ جہاں میں نے قوموں اور ملکوں کو آپس میں لڑا دیا۔ اور خصوصاً اقوام یورپ کا لہو گرمایا تو دنیا میری طاقت کا اندازہ لگا لے گی۔ انسان حیوانوں کی طرح ایک دوسرے پر غرائیں گے اور بھیڑیوں کی طرح ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں گے۔ ذرا میں کان بھر دوں تو یورپ کے امامانِ سیاست، کلیسا کے مقدس پوپ کی روحانیت اور ذہانت دھری رہ جائے۔ اور دیوانگی اور مخبوط الحواسی کی وحشت ان پر طاری ہو جائے۔ اشتراکیت سے مجھے اس لیے خطرہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ فطرت کے خلاف جنگ کرتی ہے۔ اور انسانوں کے درمیان جو طبعی فرق ہے اسے منطق کے زور سے مٹانا چاہتی ہے۔ یہ سر پھرے اور لاخیرے مجھے کب ڈرا سکتے ہیں۔

کیا امامان سیاست کیا کلیسا کے شیوخ	سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو
کارگاہ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے	توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو
دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک	مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد	یہ پریشاں روزگار آشفتہ مغز آشفتہ خو

ابلیس سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر واقعی مجھے کسی سے خطرہ ہے تو امت مسلمہ اور

ملت محمدیہؐ سے ہے۔ جس کی خاکستر میں نئی زندگی کے شرارے اور عزم و ہمت کے انگارے چھپے ہوئے اور دبے ہوئے ہیں۔ اس قوم میں ایسے اصحاب عزیمت و استقامت ابھی بھی موجود ہیں۔ جن کی سحر خیزی و شب بیداری ہنوز برقرار ہے۔ ان کی راتیں سوز و گداز' عرض و نیاز میں بسر ہوتی ہیں۔ جو اشک سحرگاہی سے وضو کرتے ہیں اور دعائے نیم شبی اور نالۂ سحرگاہی جن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس لیے زمانہ شناس جانتا ہے کہ اسلام ہی کل کا فتنہ اور مستقبل کا خطرہ ہے۔ اشتراکیت نہیں ہے۔

ہے اگر مجھکو خطر کوئی تو اس امت سے ہے   جس کی خاکستر میں ہے ابتک شرار آرزو
خال خال اس قوم میں ابتک نظر آتے ہیں وہ   کرتے ہیں اشک سحرگاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے   مزدکیت فتنہ فردا نہیں اسلام ہے

ابلیس اپنے خیالات اور خدشات کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ یہ امت قرآنی پروگرام کی حامل اور اس پر عامل نہیں۔ مال کی محبت' ذخیرہ اندوزی اور نفع رسانی کے بجائے نفع طلبی اور سرمایہ داری اس کا بھی مذہب بنتی جارہی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مشرق کی رات اور اس کا مستقبل بہت تاریک ہے۔ علمائے اسلام اور رہنمائے اسلام کے پاس وہ روشنی نہیں جس سے تاریکیاں دور ہوں۔ ان کی آستین ''ید بیضا'' سے خالی اور ان کی جماعت کسی مسیحا نفس سے محروم ہے۔ لیکن زمانے کے انقلابات اور مقتضیات سے مجھے خطرہ ہے کہ وہ کہیں اس امت کی بیداری کا سامان نہ بن جائیں اور پھر سے دین محمدی کی طرف بازگشت نہ کرنے لگیں۔ ''دین محمدیؐ'' اور شرع اسلامی کی ہمہ گیری اور کارسازی کا تمہیں اندازہ نہیں۔ اس لیے اس امت کو تھپکیاں دے دے کر سلائے رکھو' کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جاگ اٹھے اور اپنی تکبیروں سے فسانہ و افسوں اور شیطانی سحر و طلسم کے تار و پود بکھیر دے اور اس پر پورا زور لگنا چاہیے کہ شام زندگی شب زندگی میں بدلے لیکن صبح کا اجالا پھیل نہ سکے۔ پھر سن لو کہ اس امت سے اس کی بیداری سے میں اس لئے ڈرتا ہوں کہ اس کی بیداری کا مطلب ایک قوم کی بیداری نہیں بلکہ دنیا کی بیداری کے ہیں۔ اس قوم میں ذات و کائنات دونوں کا رشتہ جڑا ہوا ہے۔ اور جہاں اس میں احتساب نفس ہے وہیں احتساب کائنات بھی۔

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں   ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں   بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے   یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے ۔ تا بساطِ زندگی پر اسکے سب مہرے ہوں مات
ہے وہی شعر و تصوف اسکے حق میں خوب تر جو چھپا دے اسکی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات
مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

(ارمغان حجاز)

اقبال کی نگاہِ دور بیں نے مسلمانوں کے مستقبل کا اندازہ لگا لیا تھا۔ بالفرض اگر دنیا کی شیطانی تحریکات اور ابلیسی نظریات کامیاب ہو جاتے ہیں تو ان کے مقاصد میں سرفہرست یہی ہوگا کہ ایمان کی اس چنگاری کو بھی بجھا دیا جائے جو خاکستر ہونے کے قریب پہنچ چکی ہے۔ ان کی پہلی کوشش یہی ہوگی کہ عرب و عجم کے دلوں سے دینی حمیت اور اسلامی غیرت کو نکال باہر کیا جائے۔ جن کے سبب ان میں قربانی اور جہاد کا جذبہ کبھی بیدار ہو اٹھتا ہے۔ موجودہ صدی میں اقبال کے خدشات درست ثابت ہوئے۔ اور اسلام دشمن عناصر نے مسلمانوں کو مادیت پرستی اور لادینیت کے ایسے جال میں الجھا دیا کہ وہ اپنے دشمن کو پہچاننے سے بھی قاصر ہو چکے ہیں۔ اتفاق واتحاد پارہ پارہ ہو چکا ہے اور طاغوت کا شکنجہ انہیں چاروں طرف سے جکڑے ہوئے ہے۔ مغرب کا سیاسی نظام گویا نظام ابلیسی ہے جس نے مشرق کی اقوام کو غلامی پر مجبور کر رکھا ہے۔

اقبال نے اپنی نظم ''ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام'' میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

لا کر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں زناریوں کو دیر کہن سے نکال دو
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا روح محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرت دین کا ہے یہ علاج ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہل حرم سے ان کی روایات چھین لو آہو کو مرغزار ختن سے نکال دو

شیطان کہتا ہے کہ جو مجاہد فقر و فاقہ سے بھی نہیں ڈرتا اور نہ موت سے خوف کھاتا ہے اسے مصائب سے ڈرانے اور موت سے دھمکانے کے لئے ضروری ہے کہ روح محمدؐ اس کے قلب و قالب سے نکال دو۔ اور عربوں کی مرکزیت اور انکی سادہ فطرت و عربیت کو ختم کرنے کے لئے ان میں لادینی افکار و فلسفہ کی اشاعت کرو۔ اہل حرم سے انکی دینی میراث غصب کرلو۔ جس کے ذریعے تم اسلام کو گہوارۂ اسلام حجاز و یمن سے بھی

نکال سکتے ہو۔اور ان شورہ پشت اور سخت جان افغانوں میں دینی غیرت اب تک چلی آ رہی ہے۔اس کے لئے تمہیں وہاں کے علماء اور دیندار طبقوں سے نمٹنا ہوگا۔

اقبال شیطان کی ذات کو دنیا کی رونق' حرکت اور کشمکش کا باعث سمجھتے ہوئے اس کا احترام کرتے ہیں کہ اس کا وجود نہ ہوتا تو انسان کی خودی کی نشو ونما نہ ہوتی اور وہ بلند درجات حاصل کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ وہ شیطان کے وجود کو خیر وشر کی اقدار کے ساتھ مربوط دیکھتے ہیں اور فلسفۂ خودی کا اسے جز ولا ینفک خیال کرتے ہیں۔اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ اقبال کے نزدیک دنیا ہو یا آخرت جہاں ابلیس نہیں وہاں نہ زندگی ہے اور نہ تکمیل حیات۔

لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ انہوں نے شیطان کی بدسرشتی' تکبر' غرور اور بغاوت کے معنوں کو تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔اور خاص طور پر اپنی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں مغربی استعماری چالبازیوں کا پردہ ابلیس کی زبانی چاک کیا ہے۔اس سے ان کی سیاسی بصیرت' دور بینی اور مسلم دنیا کے مصائب ومعائب پر گہرے مشاہدے کا پتہ چلتا ہے۔یہود و نصاریٰ کی سازشیں اور عالم اسلام کے زوال کا الہام اقبال کی شاعری میں شروع سے نظر آتا ہے۔یہی وجہ ہے ابلیس تخلیق آدم کے ڈرامے سے نکل کر ایک سیاسی شعبدہ گر کی حیثیت سے نمایاں ہوتا ہے اور وہ مغربی مکر وفریب' ریا کاری اور حیلہ گری کا ترجمان بن کر ظاہر ہوتا ہے۔اور گویا اسلام کا دشمن عظیم نظر آتا ہے۔اقبال کا تصور ابلیس اس لحاظ سے بھی دوسرے تصورات سے ممیز ومتاز ہے کہ اقبال نے اپنی ذات کو ابلیس کے کردار میں گم نہیں کیا۔جیسا کہ ملٹن کے شیطان میں ملٹن کا کردار گم ہو گیا ہے۔انہوں نے ثابت کیا ہے کہ تمام مروجہ سیاسی نظام اور سیاسی نظریات شیطانی مقاصد کو پورا کر رہے ہیں۔ان نظاموں اور نظریات کو اگر کوئی خطرہ ہے تو صرف اسلام سے کیونکہ یہی ایک ایسا نظریہ اور نظام ہے جو شیطانی کارناموں کو خاک میں ملا سکتا ہے۔اقبال کی یہ پیش گوئی موجودہ صدی میں پوری ثابت ہو رہی ہے کہ طاغوتی طاقتیں مسلم ممالک کی کس طرح بیخ کنی کر رہی ہیں اور ان کی مال و دولت و وسائل کو لوٹنے کے ساتھ ساتھ دین وایمان کی غارت گری کا فریضہ کس تندہی سے انجام دے رہی ہیں۔کاش مسلمان اقبال کے پیغام کی روح کو سمجھ کر متحد ومتفق ہو جائیں۔اور دینی وایمانی جذبے سے کام لے کر ابلیس مغرب کو شکست دیں۔ورنہ زوال ہمیشہ کے لیے ان کا مقدر بن جائے گا۔

سید مرتضٰی موسوی

معاصر فارسی ادب میں پاکستان شناسی

۱۴۔اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے قیام اور آزادی کے اعلان کے ساتھ ہی پہلی مملکت جس نے پاکستان کو تسلیم کیا وہ برادر ملک ایران تھا۔اسی طرح حکومت ایران نے چند ماہ کے اندر اپنے پہلے سفیر کو کراچی روانہ کردیا، جس نے قائداعظم محمد علی جناحؒ کو اپنے کاغذات سفارت پیش کئے۔اس تقریب میں قائداعظمؒ نے ایران اور پاکستان کے تمدنی، تاریخی اور ثقافتی رشتوں کا خاص طور پر ذکر کیا۔قائداعظمؒ نے دونوں ملکوں کے برادرانہ تعلقات کو اتنی اہمیت دی کہ مرکزی حکومت کے وزیر راجہ غضنفر علی خان کو، جن کا تحریک پاکستان میں نمایاں کردار تھا، ایران میں پہلے پاکستانی سفیر کے طور پر روانہ کیا۔اپریل ۱۹۴۸ء میں ایران کے پہلے خیر سگالی وفد نے پاکستان کا دورہ کیا۔یہ وفد تین ممتاز ایرانی اخباروں کے مدیر، جن میں ایرانی مجلس کے رکن بھی تھے، جناب عباس مسعودی روزنامہ اطلاعات کے ناشر اور مدیر، جناب عبدالرحمٰن فرامرزی روزنامہ کیہان کے مدیر، اور آقای احمد ملکی روزنامہ ستارۂ ایران کے مدیر پر مشتمل تھا۔قائداعظمؒ نے اپنی علالت کے باوجود ایرانی وفد سے ملاقات کی اور اس بات پر خوشی اور مسرت کا اظہار فرمایا کہ حکومت ایران نے قیام پاکستان کے فوراً بعد اپنے سفیر کو نامزد کرکے سفارتی تعلقات قائم کئے۔پھر جب حکومت پاکستان نے مسلمان مہاجرین کی آبادکاری کے لئے قائداعظمؒ ریلیف فنڈ قائم کیا تو ایرانی حکومت نے اپنی طرف سے گرانٹ بھیجی اور پھر خیر سگالی وفد کو پاکستان کے دورہ پر بھیجا۔اس موقع پر قائداعظمؒ نے دونوں ملکوں کے تاریخی روابط کے پس منظر میں اہل قلم اور دانشور طبقے کی ذمہ داریوں کا حوالہ دیا۔

پاکستان کے پہلے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان (۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تا ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء) نے اپنے مختصر دور حکومت میں بہت کم غیر ملکی دورے کئے کیونکہ قائداعظمؒ کے انتقال کے بعد مملکت پاکستان کی بقاء اور استحکام کی خطیر ذمہ داری سے وہ عہدہ برآ ہو رہے تھے، قیام پاکستان کے صرف پونے دو سال بعد لندن میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت کرکے واپسی میں انہوں نے ایران کا دورہ کیا۔ایرانی حکومت کے نمائندین کے علاوہ وزیراعظم پاکستان نے ایرانی دانشوروں اور اہل قلم حضرات سے خاص طور پر

ملاقاتیں کیں۔

ایران اور پاکستان کے روحانی اور معنوی رشتوں میں علامہ اقبال کی فارسی شاعری کا اہم کردار ہے۔ حتیٰ کہ تشکیل پاکستان سے قبل اقبال کی فارسی شاعری بالخصوص ان کی ایران دوستی کے جذبات کی ایرانی علمی اورادبی حلقوں میں 'صدائے بازگشت صاف سنائی دیتی تھی۔ اقبال کے بیسیوں اشعار ہیں جن میں ایران اور ایرانیوں سے متعلق ان کے والہانہ طرز اظہار کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے جن میں بہت ہی مشہور ان کا ایرانی نوجوانوں سے خطاب ہے:

چون چراغ لالہ سوزم درخیابانِ شما ای جوانانِ عجم جانِ من وجانِ شما

حقیقت تو یہ ہے کہ اقبال نے برصغیر کے ایران کے ساتھ تمدنی' تہذیبی اور ثقافتی رشتوں کو جس انداز سے اپنے اردو اور فارسی کلام کے ذریعے اجاگر کیا ہے' وہ اقبال کے فلسفہ اور فکر کی ترجمانی کا اہم ذریعہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایران کے عصر حاضر کے سب سے بڑے شاعر محمد تقی بہار ملک الشعراء نے اقبال کی تجلیل ایک نادر پیرایے میں کی:

عصر حاضر خاصۂ اقبال گشت واحدی کز صد ہزاراں برگذشت

شاعراں گشتند جیشی تارومار وین مبارز کرد کار صد سوار

یہاں اس بات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۹ء کے اوائل میں صرف تین ماہ کے فاصلے سے پہلے حکومت پاکستان نے ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی کو پاکستان کے کلچرل اور پریس اتاشی کے طور پر تہران بھیجا اور ایرانی حکومت نے ڈاکٹر محمد حسین مشائخ فریدنی کو کلچرل اتاشی کے طور پر کراچی میں ذمہ داریاں سونپیں۔

یہ دونوں حضرات پیشے کے اعتبار سے معلم' شعروادب بالخصوص اقبال کے شیدائیوں میں تھے۔ چنانچہ ایران میں اقبال کی شاعری اور افکار کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ پاکستان دوستی کے ضمن میں پیشرفت ہوتی رہی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تاسیس پاکستان کے پہلے عشرے میں جن پاکستانی عمائدین نے ایران کے سرکاری یا نجی دورے کیے ان کی غالب اکثریت نہ فقط زبان وادبیات فارسی سے دلبستگی رکھتی تھی بلکہ ان میں سے بعض کو فارسی کے بیسیوں شعراء بالخصوص اقبال کے سینکڑوں شعر حفظ تھے جو وہ اپنی گفتگو اور تقاریر میں موقع محل کی مناسبت سے پڑھتے اور اس طرح ایرانی عمائدین اور سامعین کے دلوں میں اپنے ساتھ مملکت خداداد پاکستان کی بھی جگہ بنانے میں کامیاب رہے۔ ان سربرآوردہ شخصیات میں اس وقت کے وزیر تعلیم

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی' وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان' وزیر خزانہ ملک غلام محمد جو بعد میں چار سال تک گورنر جنرل کے عہدے پر فائز رہے' جناب ممتاز حسن سیکرٹری وزارت خزانہ' جناب شیخ محمد اکرام سیکرٹری وزارت اطلاعات' جناب ذوالفقار علی بخاری ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان جنھوں نے بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کے دوران یا سرکاری اور نجی سفر میں اپنی ذہانت' فارسی استعداد اور علمی و ادبی ذوق کے حوالے سے پاکستان کیلئے ایرانیوں کے دل میں ایک جگہ بنائی۔ اسی عرصہ میں پاکستان کے کئی ممتاز دانشوروں اور اساتذہ منجملہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم' ڈاکٹر محمد باقر' پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی' پروفیسر فیروز الدین رازی نے ایران کے مطالعاتی دورے کئے جس میں ان کی ایران کے مایہ ناز اہل قلم میر محمد حجازی مطیع الدولہ' ڈاکٹر حسین خطیبی' ڈاکٹر ناظر زادہ کرمانی' ڈاکٹر ابوتراب رازانی اور دیگر ایرانی اساتذہ اور ادیب و سخنور حضرات اور خواتین سے ملاقات ہوئی۔ پاکستانی دانشور اور اساتذہ کیلئے اپنے ایرانی احباب سے براہ راست رابطے کا موقع انجمن روابط فرہنگی ایران و پاکستان کی ادبی نشستوں میں میسر آیا تھا جو محترمہ ڈاکٹر نگینہ کاظمی وائس پریذیڈنٹ انجمن کے گھر پر ہوتی تھیں۔ اس دور میں علامہ اقبال کا یوم وفات پاکستان اور ملک سے باہر ''یوم اقبال'' کے طور پر منایا جاتا تھا۔ علامہ کے فارسی کلام کے حوالے سے ایران میں یوم اقبال ایک خاص جوش اور جذبے کے ساتھ ایرانی ادبی و علمی شخصیات کے بھرپور تعاون سے وزارت تعلیم و ثقافت کے وسیع ہال میں منایا جاتا۔ ان تقاریب کی صدارت اپنے وقت کے جید دانشوروں علامہ علی اکبر دھخدا' ادیب السلطنۃ سمیعی' ملک الشعراء بہار' سید صادق سرمد کرتے اور اس دور کے شعر و ادب و فلسفہ کے یونیورسٹی اساتذہ اور ماہرین علامہ اقبال کے شعر و فلسفہ پر تحقیقی مقالے اور فی البدیہہ تقاریر میں خراج عقیدت پیش کرتے۔

علامہ فیض نے ''پاکستان'' کے نام سے ایران میں پہلی کتاب قم سے شائع کی۔ پروفیسر مجتبیٰ مینوی نے ''اقبال لاہوری'' کے نام سے ایران میں اقبال پر پہلی کتاب شائع کی جس کا پہلا ایڈیشن ایران کے اس دور کے مشہور ادبی مجلے ''یغما'' کے ساتھ تقسیم ہوا۔ سید غلام رضا سعیدی نے ''استقلال پاکستان'' کے نام سے پاکستان پر انہی دنوں اپنی پہلی کتاب چھاپی۔

دانشوروں کا ایک وفد پروفیسر علی اصغر حکمت کی سربراہی میں برصغیر کے دورے پر آیا جس میں ڈاکٹر محمد تقی مقتدری بھی شامل تھے' جو ۱۹۶۰ء کے عشرے میں پاکستان میں ایران کے کلچرل کونسلر بھی رہے' ڈاکٹر مقتدری کی اقبال پر پہلی کتاب ''اقبال: متفکر و شاعر اسلام'' انہی دنوں لکھی گئی اور اقبال شناسی میں ممد و معاون

ثابت ہوئی۔ملک الشعراء بہار نے فروری ۱۹۵۰ء میں اپنا تاریخی قصیدہ ''درود بہ پاکستان'' لکھا جس نے ایران میں نظریۂ پاکستان کی نشرواشاعت میں سنگ میل کی حیثیت حاصل کرلی جس کے پانچ شعر قارئین کی ذوق طبع کی نذر ہیں۔

ہمیشہ لطف خدا بادیار پاکستان — بہ کین مباد فلک بادیار پاکستان
زرجس شرک بری شد بہ قوت توحید — ہمین بس است بہ دھر افتخار پاکستان
زفیض روح محمد علی جناح بود — محمدؐ و علیؓ و آل یار پاکستان
تپد چو طفل زمادر جدا دل کشمیر — کہ سرزشوق نھد درکنار پاکستان
زما درود فراوان بہ شیر مدانی — کہ کردہ اندسروجان نثار پاکستان

صادق سرمد پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے لیکن بیسویں صدی کے اواسط میں ملک الشعراء بہار کے بعد صادق سرمد معاصر فارسی شاعری میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔پاکستانی سفیر نے ملک الشعراء بہار کو دورۂ پاکستان کی دعوت بھی دی تھی لیکن اپنی پیرانہ سالی اور علالت کے باعث وہ پاکستان کا سفر نہ کرسکے۔لیکن خوش قسمتی صادق سرمد کے شامل حال رہی جنہوں نے ۱۹۵۰ء کے عشرے میں دو دفعہ-- پہلی دفعہ ایران کے سرکاری وفد کے رکن کے طور پر اور دوسری دفعہ حکومت پاکستان کی دعوت پر۔پاکستان کا تفصیلی دورہ کیا جس میں مشرقی پاکستان کا دورہ بھی شامل تھا۔صادق سرمد نے اپنے پاکستان کے دورے کے دوران کئی قصیدے اور قطعات کہے جس میں پاکستان اور ایران کے مشترکہ روحانی اور ثقافتی تعلقات کے علاوہ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی شخصیات کو خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔مزار قائداعظمؒ پر حاضری کے موقع پر صادق سرمد نے ''نخستین درود'' کے عنوان سے نظم کہی۔

تربت شدیم نخست درود خویش — تا برتو افگنیم نخستین درود خویش
آری سزد نخست سرودن درود تو — کز بھر حق سرودہ ای اول سرود خویش

مزید چند اشعار کے بعد اسی نظم میں کہتے ہیں:

تشکیل یافت دولت پاکان بہ ہمت — ہمت چو خواستی زخدای ودود خویش
کردی سپاہ وحدت وایمان وانضباط — تا غالب آمدی بہ عدوی عنود خویش

صادق سرمد نے قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے تاسیس پاکستان میں کردار کو کس خوبصورتی سے دو شعروں میں ڈھالا ہے:

اقبال کشت بذر و جناحش فشاندآب، اقبال کشت تخم و جناحش ثمر گرفت
قائد فراشت پرچم اقبال تا ابد کز بہر خلق پرچم فتح و ظفر گرفت

اگست ۱۹۶۷ء تک جب پاکستان اپنی آزادی کی بیسویں سالگرہ منا رہا تھا، ایران میں پاکستان اور اقبال شناسی کے موضوع پر مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ مزید پانچ کتابیں شائع ہو چکی تھیں جن میں بہ ترتیب ۱۔ اقبال شناسی، ہنر و اندیشۂ اقبال از استاد سید غلام رضا سعیدی (۱۹۵۹ء) ۲۔ مسلمانان در نھضت آزادی ہندوستان از آیت اللہ سید علی خامنہ ای (۱۳۴۷ھ ش) اس کتاب کی اشاعت نے قارئین تک اس بات کو صراحت کے ساتھ پہنچایا کہ پہلے مرحلے میں برصغیر کے مسلمان انگریز کے جانے کے بعد اپنے جائز حقوق کا تحفظ چاہتے تھے لیکن جب انہیں اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ آبادی میں موجود غیر مسلمانوں کی اکثریت کے نمائندے اس جائز مطالبے کو تسلیم نہیں کر رہے، تب انہوں نے برصغیر کی تقسیم اور مسلم اکثریتی علاقوں میں پاکستان کے قیام کے مطالبے کو ضروری جانا۔ ۳۔ کلیات فارسی مولانا اقبال لاہوری با مقدمہ و حواشی آقای احمد سروش (۱۹۶۷ء) ایران میں اقبال کی فارسی کلیات کے ایک جلد میں شائع کئے جانے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں اس وقت تک اقبال کی فارسی کلیات شائع نہیں ہوئی تھی بلکہ ہر مجموعہ الگ الگ چھپتا رہا تھا۔ ایک اور نہایت اہم نکتہ قابل غور ہے وہ یہ کہ احمد سروش نے اپنے وقیع مقدمہ میں نہ فقط علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے بلکہ تشکیل و تاسیس پاکستان کے تاریخی اور ثقافتی پس منظر کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ۴۔ احیای فکر دینی اسلام Reconstruction of Religious Thought in Islam اقبال کے خطبات مدراس و حیدر آباد کا ترجمہ استاد احمد آرام نے کیا۔ ۵۔ سیر فلسفہ در ایران Development of Metaphysics in Persia اقبال کے ڈاکٹریٹ کے تھیسز کا ترجمہ ڈاکٹر امیر حسین آریانپور نے کیا اور موخر الذکر دونوں کتابیں ۱۹۶۷ء میں آر سی ڈی کلچرل انسٹی ٹیوٹ تہران نے شائع کیں۔ یہاں اس امر کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں ھکتور بولیتو کی نوشتہ قائداعظم کی سوانح عمری انگریزی میں شائع ہوئی جس کا انگریزی نام Founder of Pakistan: Quaid-I-Azam Mohammad Ali Jinnah تھا، لیکن جب استاد غلام رضا سعیدی نے اس کا ترجمہ تہران میں شائع کیا تو عنوان میں اپنی طرف سے یہ الفاظ اضافہ کئے ''مھم ترین مرد آسیا'' (ایشیا کا سب سے اہم انسان) مندرجہ بالا کتابوں کی اشاعت کا فیض تھا کہ ایران میں اقبال فہمی اور پاکستان شناسی نے اعلیٰ تعلیمی

اداروں کے علاوہ علمی، ادبی حلقوں میں اپنا ایک مستقل مقام بنالیا۔

۱۹۵۳ء میں ایران کی وزارت تعلیم کی دعوت پر پاکستان کے پہلے ثقافتی وفد نے ایران کا سرکاری دورہ کیا۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع پرنسپل اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی ۱۴ رکنی وفد کے قائد تھے اور اپنے وقت کے سرکردہ یونیورسٹی اساتذہ، محققین، اہل قلم وسخن میں علامہ ایم یو داؤد پوتہ، ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر غلام سرور، ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر غلام نبی قاضی، پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، حفیظ ہوشیار پوری بھی شامل تھے۔ ایران کی دانش گاہوں، مطبوعاتی اور ادبی حلقوں نے پاکستانی ثقافتی وفد کی گرمجوشی سے پذیرائی کی۔

یہی وہ دور ہے جس میں ایران کے سرکردہ اساتذہ اور دانشوروں استاد سعید نفیسی، استاد بدیع الزمان فروزانفر، ڈاکٹر لطف علی صورتگر، ڈاکٹر محمد معین، ڈاکٹر حسین خطیبی، ڈاکٹر ابراہیم باستانی پاریزی اور کئی دیگر استادوں نے مختلف علمی کانفرنسوں میں شرکت کے لئے یا حکومت پاکستان کے مہمان کے طور پر پاکستان کے دورے کیے۔ ۱۹۵۲ء میں حکومت پاکستان کی وزارت اطلاعات ونشریات نے پاکستان اور ایران کے ادبی اور ثقافتی روابط کے استحکام کے لئے ایرانی فارسی کا مجلّہ "ھلال" کراچی سے جاری کیا جو پہلے بارہ سال تک "سہ ماہی" اور پھر آٹھ سال تک ماہنامے کے طور پر شائع ہوتا رہا۔ پھر یہی مجلّہ نام کی تبدیلی سے "پاکستان مصور" کہلایا اور پندرہ سالوں تک اسلام آباد سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوا۔ ان دو فارسی مجلوں کی یہ انفرادیت تھی کہ اپنے وقت میں ایران سے باہر پوری دنیا میں فارسی زبان میں شائع ہونے والے منفرد رسائل تھے، جن کا ہدف ایران اور پاکستان کے تاریخی، ثقافتی اور ادبی ورثے کو اجاگر کرنا اور دونوں ملکوں کے تعلقات کی ایک مستحکم بنیاد فراہم کرنا تھا۔ راقم کو یہ شرف حاصل ہے کہ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں بارہ سال سے زیادہ مدت تک پہلے "ھلال" اور پھر "پاکستان مصور" کی ادارت کی۔ ایران کے طول وعرض میں واقع کتاب خانوں، دانشگاہوں، مطبوعات اور شخصیات کو ان رسائل کی ترسیل کا انتظام کیا گیا تھا چنانچہ پاکستان کی تشکیل اور ترقی کے بارے میں مختلف حلقے باخبر رہتے تھے۔

۱۹۵۰ء کے عشرے میں شیخ محمد اکرام کی "ارمغان پاک" اور ڈاکٹر عرفانی کی چند کتابیں تہران میں شائع ہوئیں جس نے اقبال اور پاکستان کے حوالے سے معلومات میں مزید اضافہ کیا۔ اس دور کے سربرآوردہ شعرا نے اقبال اور پاکستان کی تجلیل میں قصائد اور قطعات کہے جن میں ادیب برومند، رہی معیری، امیری فیروز کوہی، استاد سعید نفیسی، ڈاکٹر رضا زادہ شفق، عباس فرات، کاظم رجوی، مہرداد اوستا، سیمین بھبانی اور حسین

عاطف نمایاں ہیں جن کے کلام سے اقتباس سے صرف نظر کرتے ہیں۔ ۱۳۳۹ھ ش میں آقای عبدالعظیم ولیان کی کتاب ''پاکستان'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔

۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں ''اقبال شناسی'' کے موضوع پر کئی کتابیں ایران میں شائع ہوئیں جس کے نتیجے میں قارئین کے ذہنوں میں پاکستان کے حوالے سے نئی سوچ جاگزین ہوئی۔ ان دونوں موضوعات کے درمیان براہ راست رابطے کے حوالے سے ہم آیت اللہ خامنہ ای کی فرمائش سے اقتباس کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

> ''محمد اقبال پاکستان کے مبشر اور منادی ہونے کے ساتھ پاکستان کے موسسین میں شامل ہیں اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ انسانی تاریخ میں جب تک پاکستان کا نام موجود اور باقی ہے' اقبال کا نام بھی اس کے ساتھ لیا جائے گا''۔

اس دور میں شائع ہونے والی کتابوں میں ''سرود اقبال'' از آقای فخر الدین حجازی' ''سرود اسلامی اقبال'' از سید محمد علی صغیر' ''دانای راز'' از ڈاکٹر احمد احمدی سرجندی' ''یک چمن گل'' از ڈاکٹر غلام حسین صالحی' ''محمد اقبال'' از ڈاکٹر فضل اللہ رضا چار کتابیں ''دیدن دگر آموز شنیدن دگر آموز''' 'ماو اقبال نامہ ای در دفاع از اقبال'' اور ''علامہ اقبال معمار عظیم تفکر اسلامی'' از ڈاکٹر علی شریعتی اس دور میں منصۂ ظہور پر آئیں۔ ۱۹۸۱ء میں عبدالرفیع حقیقت کی کتاب ''اقبال شرق'' تہران میں شائع ہوئی۔ ایران میں اقبال شناسی کی تاریخ میں ایک ممتاز نام ڈاکٹر محمد بقائی ماکان کا ہے' جنہوں نے گزشتہ دو عشروں میں علامہ اقبال کے حوالے سے ۲۲ سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں جن کے صفحات کی تعداد سات ہزار سے زیادہ ہے۔ ڈاکٹر ماکان سال اقبال کے حوالے سے منعقدہ سیمینار میں شرکت کیلئے اپریل ۲۰۰۳ء میں لاہور آئے تھے اور اپنے اسلام آباد کے قیام کے دوران وہ راقم کو بتا رہے تھے کہ دو تین مزید موضوعات پر وہ کام کر رہے ہیں جن کے بہت جلد چھپنے کا امکان ہے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو ایرانی نسخہ شناسوں اور فہرست نگاروں کی خدمات کا تذکرہ کیا جائے۔ آقای احمد منزوی اور ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی نے مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان کے ہزاروں خطی نسخوں کی فہرست نگاری اور پاکستان کے ممتاز کتاب خانوں کے نسخ کی مشترک فہرست کی تیاری اور اشاعت کے ذریعے پاکستان کے علمی' ادبی اور ثقافتی ورثے کی شناخت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر قاسم صافی نے چند سال قبل اپنی اسلام آباد میں ذمہ داریوں کے اختتام پر ایران لوٹ کر پاکستان کے بارے میں ایک کتاب

''سفرنامۂ پاکستان'' شائع کی جو اپنی نوعیت کی منفرد کتاب کہی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر تسبیحی نے ۱۹۶۹ء کے بعد کئی دہائیوں میں کئی علمی و ادبی کتابیں شائع کیں' لیکن ایسی کتابوں میں جن میں پاکستان کا براہ راست حوالہ موجود ہے ''فارسی پاکستانی و مطالب پاکستان شناسی'' اور ''وصف پاکستان در شعر فارسی'' نمایاں ہیں۔ موخرالذکر کتاب میں ایران اور پاکستان کے ۸۰ فارسی گو شعراء کے قصائد و منظومات شامل کیے گئے ہیں جو انہوں نے تاسیس پاکستان کے تناظر میں دونوں ملکوں کے برادرانہ روابط' اقبال دوستی اور اتحاد امت مسلمہ کے بارے میں کہے گئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر قصائد و قطعات گزشتہ پچاس سال میں مختلف فارسی کتب اور مجلات بخصوص ''هلال'' اور ''پاکستان مصور'' میں شائع ہو چکے تھے لیکن اس کتاب میں انہیں یک جا اندراج کر کے دونوں ملکوں کی نئی نسل کی آگاہی کی راہ میں اہم قدم اٹھایا گیا ہے۔

ایران کے تحقیقاتی اداروں کے حوالے کی کتب میں پاکستان کی بابت سودمند معلومات درج کی گئی ہیں۔ اس کے ضمن میں برصغیر میں گزشتہ ایک ہزار سال میں وجود میں آنے والے فارسی ادب کو اجاگر کرتے ہوئے پاکستان کی قومی زبان ''اردو'' میں فارسی کے ۹۰ سے ۶۵ فیصد الفاظ کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ ایران کی مختلف وزارتوں کی مطبوعات کا تذکرہ مناسب ہوگا جنہوں نے پاکستان کے موضوع پر قابل توجہ مواد ایرانی قارئین کے لئے مہیا کر کے کتابوں' کتابچوں اور اپنے مجلوں میں مقالات کی صورت میں شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ ایران کی نصابی کتب میں بھی موضوع کی مناسبت سے پاکستان کے بارے میں معلومات اور کلام اقبال سے انتخابات شامل درس ہیں۔

کتابیات

۱۔ اقبال ایران (اردو) ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی' سیالکوٹ' ۱۹۸۶ء

۲۔ اقبال عرفانی (اردو) ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی' مرتبہ ضیاء محمد ضیاء' سیالکوٹ' ۱۹۹۳ء

۳۔ فصلنامۂ دانش (فارسی) شمارہ ۶۷۔۶۶ (پائیز ۲۰۰۱ء و زمستان ۲۰۰۲ء) مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان' اسلام آباد

۴۔ مجلۂ اقبالیات (فارسی) شمارہ سیزدهم ۲۰۰۲/۲۰۰۳ء' اکادمی اقبال پاکستان' لاہور۔

۵۔ Speeches and Statements of Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah as Governor General, 1947-48; DFP.Islamabad 1989.

۶۔ راقم کی یادداشتیں

محمد شفیع عارف دہلوی

سید محمد ارتضیٰ ملّا واحدی☆

(دنیائے ادب وصحافت کا ایک روشن مینار)

دلی اینٹ گارے اور پتھر کے تودوں کا نام نہ تھا بلکہ یہ میرؔ غالبؔ اور داغؔ دہلوی کا شہر تھا جو علم وادب کا گہوارہ اور تہذیب وتمدن کا مرکز تھا۔ جس کے قدم قدم اور چپہ چپہ پر ایک سے بڑھ کر ایک گوہر نایاب موجود تھا۔ یہ دلی ہی تھی جس کے متعلق کبھی میرؔ نے فرمایا تھا کہ

''دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے۔۔ جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی''

۱۹۴۲ء کو جب راقم دنیائے ادب میں قدم ریز ہوا تو ہر چند کہ وہ میر غالب اور داغ کا زمانہ نہ تھا مگر اس کے باوجود دلی میں ملک کے معروف نوجوان ادبا اور شعراء کے علاوہ بہت سی نامور اور قد آور ادبی شخصیات موجود تھیں جن میں ایک عظیم ہستی جناب واحدی صاحب کی بھی تھی۔ ان کا اصل نام سید محمد ارتضیٰ اور قلمی نام ملا واحدی تھا۔ جو ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۷ مئی ۱۸۸۸ء کو بروز جمعہ کوچہ چیلان دہلی میں پیدا ہوئے۔ یوں تو دلی کا چپہ چپہ علم وادب' تہذیب وشائستگی اور ذہانت سے عبارت ہے مگر بازار بلیماران' کوچہ رحمان' کوچہ چیلان' (جو چہل ایران' کا بگڑا ہوا نام تھا) کوچہ استاد داغ اور مٹیا محل کو خاص فضیلت حاصل ہے۔

☆ حسن اتفاق کہ ملا واحدی مرحوم کے صاحبزادے جناب ایس اے۔ واحدی اسلام آباد ہی میں مستقل رہائش پذیر ہیں چنانچہ ہم نے مضمون نگار کی اس گراں قدر کاوش کی مزید توثیق وتوضیح کیلئے رجوع کیا تو موصوف نے مندرجہ ذیل کا اضافہ فرمایا۔ (ادارہ)

''واحدی صاحب کا نسبی تعلق حضرت میر محمد اکبر المعروف حکیم میر امام سید شاہ ارزانی رحمتہ اللہ علیہ المتوفی ۱۷ ربیع الثانی ۱۱۳۴ھ سے تھا۔ حکیم ارزانی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے طب یونانی کی کتابوں کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا اور طب کو عام اور ارزاں کر دیا۔ اس وجہ سے انہیں ارزانی کہا جاتا ہے۔ آپ کے والد حضرت میر محمد مقیم رحمتہ اللہ علیہ حضرت خواجہ محمد معصوم نقشبندی رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ واحدی صاحب کی پردادی میر نجف علی' آخری فوجدار خاں کی بیٹی تھیں۔ شاہ جہاں بادشاہ کو خیال آیا کہ اس کی طرف آل رسول کے علاوہ کسی کی پشت نہیں ہونی چاہیئے' لیکن تین مواقع ایسے ہیں کہ لوگ لازماً اس کی طرف پشت کرتے ہیں۔ ایک نماز جمعہ' دوسرے نماز عیدین اور تیسرے جب وہ ہاتھی پر سوار ہوتے تھے۔ شاہ جہاں نے امیر بخارا کو لکھا کہ بخارا کے مستند سیدوں میں سے تین سید منتخب کر کے بھیج دو۔ چنانچہ تین سید تشریف لائے۔ ایک کے سپرد جامع مسجد کی امامت سپرد کی گئی اور وہ امامت ابھی تک اسی خاندان میں ہے اور دلی کی جامع مسجد کے امام شاہی امام کہلاتے ہیں۔ دوسرے کے سپرد عیدگاہ کی امامت' ایک کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ بادشاہ اور فیل بان کے درمیان بادشاہ کی طرف منہ کر کے اور فیل بان کی طرف پشت کر کے بیٹھ جایا کرے۔ اس ڈیوٹی یا عہدے کا نام پیش نشینی تھا اور عہدیدار کا خطاب فوجدار خاں تھا' ایک ڈیوٹی ان کی اور تھی کہ بادشاہ تخت عدالت پر چڑھنے لگتا تو وہ تخت کے قریب کھڑے ہوتے اور بادشاہ سید کے ہاتھ کا سہارا لے کر تخت عدالت پر بیٹھتا تھا۔''

جناب ملا واحدی دہلوی مرحوم دلی کی ان معروف اور اہم شخصیات میں سے ایک ہیں جنہوں نے تمام زندگی اردو ادب اور صحافت کی خدمت کی اور اپنے مخصوص انداز نگارش کی وجہ سے ہر طبقۂ فکر کے لوگوں سے خراج تحسین حاصل کیا۔ ان کی ذہانت، صداقت، ادب سے وابستگی اور شعور کی پختگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے پندرہ برس کی عمر سے لکھنا شروع کیا -- یا یوں کہیے کہ قبائے علم و ہنر بچپن ہی میں زیب تن کی۔ نہ ادائے کافرانہ تراش آذرانہ - ایک سیدھی سادھی من موہنی صورت مگر خوددار اور غیور - دل میں حرارت ایمانی اور سر میں سودائے حق کے ساتھ ساتھ جذبۂ فروغ زبان اردو لئے ہوئے دنیائے صحافت میں قدم رکھا۔ واحدی صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کا مکروفریب اور ریاکاری کی دنیا سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ کیونکہ زبان کی حرمت اور قلم کی آبرو اس میں ہے کہ سچ بولا جائے اور سچ لکھا جائے۔ اگر حق کہنے پر زبانیں کھینچنے اور ہاتھ قلم ہونے لگیں تو ہو جائیں مگر تقدیس زبان و قلم مجروح نہو۔

واحدی صاحب نے لکھنے کی ابتدا ہفت روزہ اخبار وطن (لاہور)، روزنامہ اخبار پیسہ لاہور اور سہ روزہ ''وکیل'' امرتسر سے کی اور زندگی کے آخری سانس تک لکھتے رہے۔ اس طرح ان کی زندگی دنیائے ادب اور صحافت میں چند برس کی کہانی نہیں بلکہ پون صدی کا قصہ ہے۔ پچھتر سال کا طویل زمانہ جو وقت کی اہم ضرورتیں اپنے دوش پر لئے ان کا ہمرکاب رہا۔ ابھی اس نوجوان کی عمر صرف اکیس (۲۱) برس کی تھی کہ دلی کے معروف ادیب مصور فطرت شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کے ساتھ مل کر دہلی سے رسالہ نظام المشائخ جاری کیا اور نائب مدیر کی حیثیت سے اپنی خدمات سرانجام دینا شروع کیں۔ اس کے بعد ایک رسالہ ہفت روزہ ''طبیب'' مسیح الملک جناب حکیم اجمل خانصاحب کی سرپرستی میں دہلی سے جاری کیا۔ اس کے علاوہ کئی اور ادبی جریدے بھی شائع کیے۔

واحدی صاحب کی ذہانت، محنت اور صلاحیت کا اندازہ قارئین اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ۱۹-۱۹۱۸ء میں نو ایسے مقبول اردو پرچے تھے جو دہلی سے ان کی ادارت یا زیرنگرانی شائع کئے جارہے تھے اور یہ یقیناً غیر معمولی بات تھی۔ ان پرچوں میں چار ماہنامے، چار ہفت روزہ اور ایک روزنامہ شامل ہے۔ بقول سردار دیوان سنگھ مفتوں مدیر ''ریاست'' ''ملا واحدی دلی کی وہ مایہ ناز ادبی ہستی تھی جس نے کوچہ چیلان کی زرخیز مٹی کو رسالوں اور اخباروں سے گلزار کیا اور پھر قبرستان بنا کر پاکستان چلی گئی''۔ یہ الفاظ ایک عام آدمی کے نہیں بلکہ ایک مستند اور لائق مدیر کے ہیں جو جناب واحدی کی اعلیٰ صحافی حیثیت اور ادبی شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔

پاکستان ہجرت کرنے کے بعد موصوف نے نظام المشائخ دوبارہ کراچی سے جاری کیا اس کے علاوہ ماہنامہ "بیداری☆" اور "فردوس" وغیرہ بھی شائع کئے جن کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ تقسیم ہند سے قبل آل انڈیا ریڈیو دہلی سے واحدی صاحب نے بیشمار اخلاقی سماجی اور اصلاحی تقاریر نشر فرمائیں اور ان کی مقبولیت اور طلب اس قدر بڑھی کہ بعد میں "مضامین واحدی" کے نام سے انہیں شائع کرنا پڑا۔

پاکستان میں نظام المشائخ کے بند ہو جانے کے بعد جناب حمید نظامی کے اصرار پر واحدی صاحب نے "تاثرات" کے عنوان سے نوائے وقت، جنگ اور ہلال وغیرہ میں نہایت پُرمغز اور گرانقدر مضامین لکھنا شروع کئے جن کو بڑی شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی۔ ان مضامین کی شہرت اور افادیت کے پیش نظر جناب حکیم محمد سعید دہلوی نے ۱۹۷۰ء میں "تاثرات" کی ایک جلد کتابی شکل میں شائع فرمائی۔ اس طرح واحدی صاحب کی ادبی سرگرمیاں اور خدمات کم و بیش ستر (۷۰) پچھتر (۷۵) سال پر محیط ہیں۔

واحدی صاحب ایک منفرد انداز نگارش اور اسلوب کے مالک تھے۔ موصوف کی زبان انتہائی سلیس سادہ اور عام فہم تھی۔ وہ بڑے سے بڑا مسئلہ اور الجھی ہوئی بات اس قدر آسان زبان اور دل نشیں انداز میں بیان فرماتے کہ بات قارئین کے دلوں پر نقش ہو جاتی۔ حقیقت میں یہ موصوف کی وسعتِ نظری، شعور و ادراک کی پختگی اور قلم کی سحر انگیزی کی واضح دلیل ہے جو بہت کم ادیبوں اور لکھنے والوں کو میسر آتی ہے۔ آپ کی تصانیف میں "حیات سرور کائناتؐ" "میرے زمانے کی دلی" "سوانح حیات حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی" "مضامین واحدی" "تاثرات" اور میرا افسانہ یعنی "سوانح عمری ملا واحدی" بہت مقبول ہیں۔ واحدی صاحب نہایت نیک سیرت، خلیق اور پُرخلوص انسان تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے دوست احباب اور پرستاروں میں مسلمانوں کے علاوہ ہر قوم اور ہر طبقۂ فکر کے لوگ شامل تھے۔ وہ جہاں بھی جاتے نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے اور ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، حکیم اجمل خاں، شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی، ادیب الملک نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی، مولانا مودودی، نیاز فتح پوری، خان بہادر حبیب الرحمٰن (چیرمین دہلی میونسپل کمیٹی) جناب حکیم محمد سعید دہلوی، دیوان سنگھ مفتوں، مولانا رازق الخیری، امداد صابری، حمید نظامی اور بیشمار بلند پایہ شخصیات سے ان کے

☆ جناب ایس اے۔ واحدی کی یادداشت کے مطابق "بیداری" کا اجراء دلی ہی سے ہوا تھا۔

ذاتی مراسم تھے اور ہر شخص ان کے خلوص کا گرویدہ اور قلم کا مداح تھا۔☆

جناب ملا واحدی کی زندگی کا ہر لمحہ ادبی خدمات سے تابندہ و درخشاں نظر آتا ہے۔ ادب، اردو زبان کی ترویج و ارتقاء اور خدمت خلق ان کی زندگی کے مرکز اور محور تھے۔ ان کی جدوجہد، شوق اور والہانہ لگن کا یہ عالم تھا کہ زندگی کے آخری ایام میں بھی جبکہ وہ شدید بیمار تھے "پارۂ عم" کی تفسیر سپردِ قلم کرنے میں مصروف تھے کہ فرشتۂ اجل آیا اور ۲۲۔ اگست ۱۹۷۶ء کو ملا واحدی نے اپنے خالق حقیقی کی طرف مراجعت فرمائی۔ اناللّٰہ وانا الیہ راجعون۔

جناب واحدی کی کچھ غیر مطبوعہ تخلیقات اور دیگر نادر و نایاب یادداشت پر مبنی مسودات موصوف کے نبیرہ جناب سید اوصاف علی واحدی دہلوی کے پاس محفوظ ہیں۔ جناب اوصاف علی واحدی بذاتِ خود ملک کے معروف ادیب ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ موصوف اس گرانقدر ادبی ورثہ کو منظرِ عام پر لانے کی طرف ضرور توجہ فرمائیں گے۔

آیئے اب جناب ملا واحدی کے انداز نگارش کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمالیں۔ یہ اقتباس موصوف کے ایک مضمون بعنوان "اگلے وقتوں کے لوگ" سے لیا گیا ہے جسے جناب حکیم محمد سعید شہید دہلوی نے مقالاتِ شامِ ہمدرد ۶۶۔۱۹۶۵ء میں شامل کیا ہے۔

"واحدی صاحب" بدلے ہوئے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بھائی! ان ہنگاموں میں ہم لوگوں کی حالت بجائے سدھرنے کے اور بگڑ گئی۔ مروت کی جگہ دیدہ دھویا پن، محبت کی جگہ قابوچی پن اور وفا کی جگہ دغا زور پکڑ گئی اور چونکہ یہ حرکات منشائے خداوندی کے خلاف ہیں، اندیشہ ہے کہ ابھی اور بھوگ بھوگنے پڑیں گے۔ اللہ غریق رحمت کرے دلی مرحوم کو، پچاس برس پہلے کی دلی تھی گویا باہمی منافرت کی تخم ریزی شروع ہوگئی تھی، لیکن ابھی شگوفہ کھلا نہیں تھا جس نے بعد میں کٹا چھنی کی نوبت پہنچائی۔ اس وقت تک ہندو مسلمان ایکم ایک تھے' کیونکہ اگلے وقتوں کی مروت اور محبت کے نمونے اور عہدِ گزشتہ کے بچے کھچے لوگ دونوں قوموں میں موجود تھے۔ اس وقت اللہ بخشے مرزا یارن جان کشمیری (رفوگر) یاد آ گئے۔ عام رواج

☆ ان حضرات کے علاوہ جناب ایس اے۔ واحدی نے مندرجہ ذیل اسمائے گرامی کا بھی اضافہ فرمایا ہے۔ (ادارہ)
"مصورِ غم علامہ راشد الخیری، حضرت علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی اور گورنر اڑیسہ خواجہ ناظم الدین اور خواجہ شہاب الدین۔"

تھا کہ فارغ البال حضرات شام کو جوڑیوں میں سوار ہو کر اور دوسرے حضرات پا پیادہ سیر و تفریح کو یا میل ملاقات کیلئے نکلا کرتے تھے۔ مرزا صاحب کی دکان چاوڑی بازار میں منجھ کی جگہ تھی۔ مرزا صاحب کا معمول تھا کہ عصر کے بعد کام کاج کے متعلق تمام چیزوں کو سمٹوا کر دکان کی کوٹھری میں ڈلوا دیتے تھے۔ کوٹھری کے دروازہ پر شال کا پردہ لٹک جاتا۔ دکان میں سفید براق چاندنی بچھتی جس پر سلوٹ کا نام نہ ہوتا۔ دیکھو تو دکان چندن سی پڑی ہے' شام ہوئی اور مرزا صاحب نے کپڑے بدلے' اوپر سے مہین جھاگ سی تن زیب کا نیچی چولی کا انگرکھا پہنا اور چھوٹے سے گاؤ تکیہ کے سہارے دکان کے سرے پر اس طرح آ بیٹھے کہ پشت حوض قاضی کی طرف رہے اور منھ بڑھ شاہ بولا کی طرف۔ ایک شاگرد کو سامنے بٹھاتے کہ جو سواری حوض قاضی سے چاوڑی بازار میں داخل ہو فوراً بتائے۔ شام کے وقت مرزا صاحب کی دکان رفوگر کی نہیں تھی' سیر گاہ عام تھی۔ دکان کے نیچے پٹری پر مونڈھے پڑے رہتے تھے ان پر ایسے سیلانی جیوڑے جن کی مرزا صاحب سے یاد اللہ تھی آتے جاتے ٹیکی لگاتے تھے۔

جیٹھ' بیساکھ کی گرمیاں ہیں۔ سورج غروب ہو رہا ہے۔ دونوں وقت ملا چاہتے ہیں۔ دن بھر کی چلچلاتی دھوپ سے تپتی ہوئی زمین پر سقوں کے چھڑکاؤ نے سوندھی سوندھی خوش بو پھیلا دی ہے۔ ادھر پھول والوں کے جہاں تہاں' تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ٹھیے' موتیا' بیلا' رابیل' موگرا' چنپا کے پھولوں کی ڈھیریاں' گجرے' کنٹھے' ہار' مالا چھبیوں میں کیلوں کے پتوں پر رکھے ہیں اور بازار کو مہکا رہے ہیں۔

اب وہ بات آتی ہے جس کے لیے میں نے یہ سارا قصہ چھویا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمایئے' قاضی کے حوض کی طرف حکیم عبدالمجید خاں کی سواری دکھائی دی۔ سیاہ' مشکی جوڑی' قد آور' منھ زور' کس بل کے دھنے گھوڑے' بگی میں جتے ہوئے ہیں۔ گھوڑوں کی منھ زوری دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ گاڑی کے بموں سے نکلے جاتے ہیں۔ حکیم صاحب قبلہ راسیں کھینچے' گھوڑوں کی شوخی کو لگام دیئے اور انہیں قابو میں کیے چلے آ رہے ہیں۔ مرزا صاحب نے ٹوپی اور سر کے بال درست کیے۔ ڈنٹروں پر نظر ڈالی کہ آستین میں کہیں شکن چُرس تو نہیں ہے۔ انگرکھے کی چولی پر ہاتھ پھیرا اور ٹھیک ہو کر بیٹھ گئے۔ بگی دکان کے آگے پہنچی۔ حکیم صاحب نے سلام میں سبقت کی۔ مرزا صاحب نے ذرا بلند ہو کر سلام کا جواب دیا۔ بگی یہ جا وہ جا۔ تھوڑی دیر بعد لالہ رام کشن داس جی خلف لالہ چھنا مل جی کی سواری آئی۔ شاگرد نے حسب معمول اطلاع دی۔ مرزا صاحب نے وہی پینترے بدلے۔ وہ بھی گزر گئے۔ ابھی چھوٹے لال جوہری' لالہ مینا مل ڈھولیا والے' نواب احمد سعید خاں'

حکیم ظہیر الدین خاں، ڈپٹی ہادی حسین خاں، ڈپٹی الٰہی بخش کی سواریاں آ جا رہی ہیں اور مرزا صاحب سے دعا سلام کے کیا کہنے۔ سنی سنائی نہیں، آنکھوں دیکھی بات ہے، ایک دن حکیم عبدالمجید خاں خدا جانے کس خیال میں مستغرق تھے کہ بگی مرزا صاحب کی دکان سے آگے نکل گئی اور حکیم صاحب نے توجہ نہیں کی۔ اب صورت یہ ہے کہ بگی کے گھوڑے اور اس کے اگلے پہیے دکان سے آگے نکل چکے ہیں اور پچھلے پہیے دکان کے مقابل ہیں کہ حکیم صاحب وہیں رکے۔ ان لوگوں کی وضع داریوں اور انداز شناسیوں نے جھرجھری سی لی، گویا کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی اور گردن موڑ کر مرزا صاحب کو سلام کیا۔ بندہ اس وقت وہاں موجود تھا۔ مرزا صاحب بہت خوش ہوئے۔ نوجوان انہیں چچا میاں کہا کرتے تھے اور وہ سب کو بھتیجا کہتے تھے۔ بولے، بھتیجے! دیکھا شریف ہیں شریف۔

''غرض آپ کا خط پڑھ کر ہمیں مرزا یاران جان، اللہ مغفرت فرمائے، یاد آ گئے۔ خوش نصیب تھے کہ یہ وقت نہ دیکھا، ورنہ سر دیواروں سے ٹکراتے اور مر جاتے۔ اب نہ وہ مرزا جی ہیں اور نہ ان کے وہ دیوانے ہاؤلے قدردان۔ مرزا جی کے ٹھڑے کو انقلاب کی آندھی نے دلی سے راولپنڈی لے جا پٹکا۔ سنا ہے ان کے لڑکے نے وہاں دکان کر لی ہے اور وہ خود اور ان کے ہم عصر دلی کے قبرستانوں میں پاؤں پسارے پڑے ہیں۔ تصور میں اس امی جمی کے نقشے کھینچتے ہیں تو زندگی بے حلاوت ہو جاتی ہے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔'' ☆

اچھا صاحب! ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا ایک فقرہ نقل کر کے یہ داستان ختم کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا:

> ''شاید ایسا وقت آ جائے کہ لوگوں کے پاس ان باتوں کے سننے کا وقت نہ رہے اور جب ان باتوں کی مانگ نہیں ہوگی تو پھر کوئی کیوں ان باتوں کو سناتا پھرے گا''۔ خدا حافظ
>
> شام ہمدرد، کراچی، ۱۰ جون ۱۹۶۵ ش (اقتباس تمام شد)

دلی اجڑ گئی، یہ تو اجڑتی چلی آئی ہے مگر اس بار ۱۹۴۷ء میں اس طرح اجڑی کہ اس کے مکیں اس کے شیدائی دوبارہ اسکی سرزمین پر آباد نہ ہو سکے۔ دلی کے گلی کوچے جو قدیم تہذیب و شائستگی کے آئینہ دار تھے ان پر حسرت ٹپکتی نظر آتی ہے۔

دہلی کا لال قلعہ، جامع مسجد، پریڈ گراؤنڈ (جہاں ہرے بھرے صاحب اور شیخ کلیم اللہ جہان آبادی

☆ یہ خواجہ فضل احمد شیدا کے خط کا حوالہ ہے۔ (ایس اے۔ واحدی)

رحمت اللہ کے مزارات تھے اور جو زائرین سے بھرے رہتے تھے) اردو بازار، وہ قدیم کتب خانے جو ارباب عقل و دانش اور اہل علم و فضل کے مراکز تھے۔ جہاں کبھی مرزا غالب، مومن، حالی، شیفتہ اور ان کے بعد داغ دہلوی، پنڈت امرناتھ ساحر، پنڈت برج موہن (دتاتریا) کیفی، خیام الہند حیدر دہلوی آغا شاعر، عرش ملسیانی، حضرت بیخود دہلوی، حضرت نواب سراج الدین خانصاحب سائل، علامہ راشد الخیری، مولانا رازق الخیری، ملا واحدی، حکیم اجمل خاں، خواجہ محمد شفیع دہلوی اور حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی جیسی عظیم ہستیاں تشریف لاتی تھیں اور علوم بحر بیکراں کے چشمے پھوٹتے اور ابلتے تھے آج سب دیدۂ کور کی طرح بے نور ہیں۔

جامع مسجد کا وہ شاندار مشرقی دروازہ جس کی چوڑی چکلی سیڑھیاں چٹ پٹے کھانوں کے خوانچہ فروشوں -- (حلیم، سیخ کباب، دہی بڑے، لونگ چڑے اور بالائی کی قلفی، فالودہ وغیرہ) والوں سے بھری رہتی تھیں اور جہاں ہر مذاق اور ہر شوق کا آدمی اپنی پسند کی چٹ پٹی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتا اور چٹخارے بھرتا نظر آتا تھا، آج بے رونق پڑی ہیں۔

درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء، حضرت امیر خسرو، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ، قطب مینار، گندھک کی باولی، بین کی چھتنگی اور اولیاء مسجد سب موجود ہیں مگر اپنے قدیم شیدائیوں اور شائقین کے سوگ میں گریہ کناں ہیں۔

آج دہلی کی آبادی پہلے سے دوگنی اور چوگنی ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نئی دنیا کی مخلوق یہاں آ کر آن بسی ہے۔ جس کی چال ڈھال، رہن سہن، گفتگو، لباس، ادب آداب، فکر و احساس سب مختلف اور جدا ہے۔ دلی کی وہ قدیم تہذیب و شائستگی جو صدیوں پر محیط تھی اور جو اہل مشرق کیلئے طرۂ امتیاز تھی اب خواب بن چکی ہے۔ دلی کے وہ قدیم خاندان جو تقسیم ہند کے نتیجہ میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے تھے ان میں سے بیشتر تو گزشتہ پچاس سال میں زمین کا پیوند ہو گئے۔ دس پانچ فی صد جو باقی رہ گئے ہیں وہ چراغ سحری ہیں۔ ان کے بعد یہ داستان دیرینہ جو خوشگوار بھی ہے اور دلخراش بھی -- اس کو سننے اور سنانے والا بھی کوئی باقی نہیں رہے گا۔ سب خاک میں مل جائینگے۔ یہی دنیا کا چلن ہے اور یہی زمانے کا دستور۔ "اللہ باقی من کل فانی"۔

حمایت علی شاعر

رحمان بابا

(پشتو کا ایک عظیم شاعر)

رحمان بابا---خوشحال خاں خٹک کے ہم عصر تھے اور خوشحال خاں خٹک کے بارے میں علامہ اقبال کی نظم ''خوشحال خاں کی وصیت'' بال جبریل میں ہم سب کی نظر سے گزر چکی ہے۔

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم   کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے ان جوانوں سے ہے   ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
مغل سے کسی طرح کم تر نہیں   کہستاں کا یہ بچۂ ارجمند
کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات   وہ مدفن ہے خوش حال خاں کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں بادکوہ   مغل شہسواروں کی گردِ سمند

ان پانچ اشعار میں نہ صرف افغانیوں کا تاریخی کردار جھلکتا ہے بلکہ ان کی غیرت' شجاعت' خودداری اور بالخصوص مغل شہنشاہیت کے خلاف ان کی بغاوت اور بادشاہت کے زیرِ اثر آمرانہ طرزِ حکومت سے نفرت بھی نمایاں ہوتی ہے۔ وہ اپنے مدفن پر بھی' مغل شہسواروں کی گردِ سمند برداشت نہیں کرتے تھے۔

اورنگ زیب کے خلاف شمال میں خوشحال خاں خٹک نے بغاوت کی تھی اور جنوب میں شیواجی مرہٹہ نے--- وہ چونکہ ہندو تھا اس لیے ہمارے مورخین اسے کسی اور انداز میں پیش کرتے ہیں حالانکہ اس کے چھاپہ مار دستوں میں بہت سے ''مقامی مسلمان'' بھی شامل تھے۔ خوشحال خاں اپنی قوم کا ہیرو ہے۔ وہ بحیثیت شاعر بھی پشتو ادب میں ایک بڑا مقام رکھتا ہے۔

رحمان بابا---جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا' خوشحال خاں کے نہ صرف ہم عصر تھے بلکہ ان کے ہم خیال بھی تھے۔ وہ بھی اپنی شاعری میں اپنی قوم کو وہی پیغام دیتے ہیں جو خوشحال خاں خٹک دے رہے تھے۔

میں پشتو زبان نہیں جانتا اس لیے ان کے منتخب اشعار کا ترجمہ پیش کروں گا۔ یہ ترجمے ہمارے محترم

دوست رضا ہمدانی اور فارغ بخاری نے کیے۔ خوش حال خاں نے علامہ اقبال کے الفاظ میں کہا تھا کہ

"قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم"

رحمان بابا کہتے ہیں:۔

"میں عاشق ہوں اور عشق کے علاوہ کسی دوسری چیز سے سروکار نہیں رکھتا۔ نہ خلیل ہوں نہ داؤدزئی اور نہ مہمند۔۔"

یہ سب افغانی قبائل کے نام ہیں جن سے رحمان بابا نکل آنے کی تعلیم دیتے ہیں۔۔ علامہ اقبال نے "عام مسلمانوں کے لیے" بھی یہی کہا تھا۔

بتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا　　نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

اور

ایک ہوں مسلم، حرم کی پاسبانی کے لیے　　نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر

علامہ اقبال نے ان افغان شاعروں سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ہندوستان میں وہ ایک طرف بھرتری ہری اور کبیر داس سے متاثر تھے تو دوسری طرف سرحد کے شعراء خوشحال خاں اور رحمان بابا کے عاشق تھے۔

رحمان بابا اپنی قوم کے مذہبی لوگوں کے کردار سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ مولوی اور مُلاّ کے بارے میں بھی انہوں نے بہت صاف الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

۱۔ "رات کو مظلوموں کا خون پیتا ہے اور دن کو منبر کی زینت بنتا ہے"

۲۔ "دل توے کی طرح سیاہ اور چہرہ چاند کی طرح۔۔ نام قلندر لیکن طلبِ مال میں سرگرداں۔۔ منہ میں کلمہ اور دل میں بے یقینی (ایسا آدمی) منافق ہے۔۔ نہ مسلم نہ کافر"

علامہ اقبال بھی ملاؤں اور شیخوں کے بارے میں یہی کہتے ہیں۔

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں　　ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں　　نے جدّتِ گفتار ہے، نے جدّتِ کردار

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے　　اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

علامہ اقبال کے ان اشعار کا فیضان ہے کہ ہمارا عہد بھی ان کے خیالات سے جگمگا رہا ہے جو روشنی

انہوں نے اپنے ماضی کے باغی شاعروں سے حاصل کی۔ وہ مستقبل کے شعرا کو بھی عطا کر دی ہے۔ ایک تازہ شعر یاد آ رہا ہے۔

جب آدمی میں ہوتا ہے بیدار مولوی　　　وہ وقت بھی عذاب الٰہی سے کم نہیں

ان مذہبی شخصیتوں کے "کردار" نے تاریخ میں وہ گل کھلائے ہیں کہ ان کے نام اپنے معنی کھو چکے ہیں۔ قاضی، مولوی، ملا، شیخ، زاہد اور اسی قسم کے بیشتر "محترم نام" اب کن معنوں میں استعمال ہونے لگے ہیں اور ان کا کس کس انداز میں مذاق اڑایا جانے لگا ہے۔ فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار تاریخ کی زندہ گواہی بن گئے ہیں۔ اسی لیے شاید فیض صاحب نے کہا تھا۔

شکر ہے زندگی تباہ نہ کی　　　شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی

رحمان بابا کے دور میں بھی یہ کردار شعرا کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ ان کی منافقانہ روش عام آدمی سے لیکر خاص لوگوں تک مثال ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے بھی اپنی ایک ثلاثی میں علامہ اقبال کے ایک مصرعے سے فائدہ اٹھایا ہے۔

اپنے ایماں کی سرِعام نمائش کے لیے　　　زندگی بھر تو نہیں، ہاں مگر اک وقت نماز

"ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز"

رحمان بابا بھی معاشرے کی طبقاتی تقسیم کے قائل نہیں تھے۔ وہ سب انسانوں کو ایک سا دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اپنی زندگی کی طرح، دوسرے کی زندگی کو بھی عزیز رکھ، کیوں کہ تیری طرح اس کی بھی زندگی ہے"۔

دنیا کے ہر بڑے آدمی نے مساوات کی تعلیم دی ہے۔ دولت و ثروت، اور حکومت و سلطنت کے خلاف اللہ کے بندوں کو اکسایا ہے۔ انہیں سیم و زر سے نفرت دلائی ہے اور ان لوگوں نے بھی نفرت کرنا سکھایا ہے جو دولت کے پرستار ہوتے ہیں کیونکہ دولت ہمیشہ دوسروں کا حق مار کر حاصل ہوتی ہے۔ "اکل حلال" سے کوئی انسان بڑا سرمایہ دار نہیں بن سکتا۔۔۔ رحمان بابا کہتے ہیں۔

"جو انسان کو بے آب بنا دے یعنی اس کی اصل آب و تاب سے محروم کر دے، ایسے سیم و زر سے اللہ بچائے"

"زور آور اگر کسی کو فائدہ بھی پہنچاتا ہے تو ہمیں احتیاط رکھنی چاہیے کیوں کہ اس میں لازماً ضرر ہو گا"۔

مجھے میر تقی میر کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

نہ مل میرؔ ہرگز امیروں سے تو ہوئے ہیں غریب ان کی دولت سے ہم

شاید ہمارے عہد کے ایک شاعر کے یہ اشعار بھی آپ کی نظروں سے گزرے ہوں۔

پسِ معابد و درگاہ جو سیاست ہے کبھی تو سوچتے ہم' کیا یہی عبادت ہے؟
زمین دار' وڈیرے کہاں سے آئے ہیں؟ یہ دن دہاڑے اندھیرے کہاں سے آئے ہیں؟
جوان کے پاس ہے دولت' کہاں سے اتری ہے؟ زمیں سے نکلی ہے یا آسماں سے اتری ہے؟
یہ فیض ہے کسی سلطاں کی مدح خوانی کا کہ ہے صلہ یہ فرنگی کی مہربانی کا؟
اثاثہ جو بھی ہے ان کا--حلال ہے کہ حرام؟ کبھی تو ہم کو بتاتا کوئی فقیہہ و امام

میرؔ سے لیکر موجودہ دور تک سوچ کا وہی انداز ہے جو اپنے دور میں رحمان بابا نے اختیار کیا تھا۔

۱۔ ''دولت' آدمیت کا نام نہیں' بت اگر سونے کا بھی ہو جائے تو پھر بھی انسان نہیں بن سکتا''۔

۲۔ ''غریب اور امیر کا کیا میل' وہ دونوں ایک گاؤں میں بھی نہیں رہ سکتے۔ کہاں خان عزیز خاں اور کہاں ملنگ عبدالرحمان''

۳۔ ''تم اپنے خدا کے سامنے اتنا نہیں جھکتے جتنا بادشاہ یا خان کے در پر''

۴۔ ''دولت کے گرد وغبار سے جو دل ملوث ہو جاتے ہیں وہ در حقیقت ظلمت میں گھر جاتے ہیں''

۵۔ ''حکام کے ظلم وستم کے باعث آگ' قبر اور پشاور--تینوں ایک حیثیت رکھتے ہیں''

رضا ہمدانی کے الفاظ میں

> ''رحمان بابا کے یہ قابل قدر خیالات پشتو ادب کا بہترین سرمایہ ہیں۔اس میں اس نے نہ صرف معاشرے کے ناسوروں کو نشتروں سے چھیڑا ہے بلکہ اندمال کا مرہم بھی تجویز کیا ہے۔رحمان بابا نے اپنے اشعار میں نہایت صاف الفاظ میں کہا ہے کہ--
>
> بت کو سجدہ کرنا اور دنیا کو سجدہ کرنا' ایک ہی بات ہے۔دنیا کا پرستار' بت پرست ہے''۔

اور اسلام نے ہمیں ''بت شکنی'' کی تعلیم دی ہے۔رحمان بابا جس دور کے شاعر تھے اس دور میں ان تمام آلائشوں اور تاریکیوں سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا--تصوف''

اکثر شعرا کے پاس صوفیانہ فکر' انہیں مسائل کے ردعمل کے طور پر آئی ہے۔اہل شریعت' جب قابل اعتبار نہیں رہے' ہزار فرقوں اور خانوں میں بٹ گئے تو اہل دل اور اہل نگاہ وفکر--اہل طریقت کی طرف متوجہ

ہو گئے۔ بادشاہ کی لعنت سے چھٹکارا پانے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ وہ دنیا سے کٹ گئے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی' بلھے شاہ' خواجہ فرید اور رحمان بابا کی طرح سبھی کے مضطرب دلوں نے تصوّف میں سکون پایا۔

تصوّف ایک اور زاویے سے بھی انسانوں کی توجہ کا مرکز تھا۔ میں فی الحال اس سے بحث نہیں کروں گا۔ اسلام میں محی الدین ابن العربی سے اس کا آغاز ہوتا ہے اور فکر کے مختلف منازل طے کر کے' ہندوستانی صوفیائے کرام کی تعلیمات میں' جس طرح اس کا ظہور ہوتا ہے وہ اپنی ایک الگ تاریخ رکھتا ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں ویدانت کے ساتھ' وحدت الوجودی عقائد نے مل کر جو صورت اختیار کی' اس کا ایک ردّعمل ''وحدت الشہود'' کی صورت میں بھی نمایاں ہوا اور فکر کے نئے در' باز ہوئے۔ یہ سب بحث طلب مسائل ہیں۔ علامہ اقبال تک آتے آتے یہ مسائل بھی ہماری شاعری کا حصہ بنے۔ لیکن رحمان بابا کا زمانہ اور تھا۔ اس دور میں سبھی صوفی شعرا کی فکر یکساں تھی۔ ان کی عشقیہ شاعری بھی مجاز سے حقیقت تک اپنے مخصوص انداز میں سفر کرتی نظر آتی ہے۔ رحمان بابا کی عشقیہ شاعری کے بارے میں کچھ مختصراً عرض کروں گا۔ کچھ اشعار کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ ''تمام دنیا عشق سے پیدا ہوئی ہے' عشق ساری مخلوق کا باپ ہے''

۲۔ ''کسی بادشاہ کا نام بھی اتنی قدر سے نہیں لیا جاتا جس طرح مجنوں اور فرہاد کا''۔

۳۔ ''رباب نے اپنے خالی پیٹ' قناعت کی' اس لئے اس کا نغمہ دلپذیر ہو گیا''

۴۔ ''تیرے عشق کی موج مجھے کسی طرف جانے نہیں دیتی۔ میرے دونوں ہاتھ عشق کی پیرا کی میں مصروف ہیں''

۵۔ ''دنیا میں ایسا سورج نہیں جو قد' زلفیں اور سرخ ہونٹ رکھتا ہو مگر میرا محبوب''

رحمان بابا پشتو میں غزل کہتے تھے۔ غزل فارسی سے پشتو اور اردو میں آئی ہے۔ ان کی غزل میں تغزل بھی ہوتا تھا اور سراپا نگاری بھی۔

۱۔ میں نے جب تیرے ابروؤں کے درمیان ''خال'' دیکھا تو خیال آیا کہ نہ تو کہیں ایسا امام ہے اور نہ محراب''۔

۲۔ پریوں کے غیر مرئی ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ تجھ سے مرعوب ہو کر منہ چھپا رہی ہیں''

۳۔ چاند---رات کو اس لیے جلوہ دکھاتا ہے کہ دن کو تمہارے سامنے آنے کی جرات نہیں کرتا''۔

۴۔ ''ان لوگوں کا منہ کالا کرنا چاہیے جو تیرے سامنے آفتاب کی تعریف کرتے ہیں۔''

۵۔ ''تمہارے چہرے کے ورق پر خدو خال ہیں اور قرآن کے ورق پر اعراب ہیں''۔

رحمان بابا کی شاعری کئی خصوصیات رکھتی ہے اور بلاشبہ پشتو ادب میں اس کا ایک خاص مقام ہے۔ لیکن اس عظیم شاعر کے حالات زندگی سے تاریخ ادب نا آشنا ہے۔ ان کے ساتھ بھی وہی حادثہ ہوا جو حافظ شیرازی کے ساتھ ہوا۔ ''تپہ خزانہ'' جو پشتو کا بہت پرانا تذکرہ ہے اس میں کچھ حالات ملتے ہیں۔

رحمان بابا ۱۰۴۲ھ یعنی آج سے تقریباً چار سو سال پہلے پشاور کے ایک گاؤں ''بہادر کلی'' میں پیدا ہوئے اور ۱۱۱۸ھ میں انتقال کیا۔ والد کا نام عبدالستار تھا جو ''سڑہ بنی مہمند'' قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے چچیرے بھائی کا سلوک ان کے ساتھ اچھا نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ اپنا گاؤں چھوڑ کر ہزار خانی میں آ گئے تھے۔ اور آخری عمر تک وہیں رہے۔ اسی گاؤں میں ان کا مزار ہے جہاں ہر سال عظیم الشان میلہ منعقد ہوتا ہے اور مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔

رحمان بابا نے اورنگ زیب اور شاہ عالم کا زمانہ دیکھا ہے۔ ان کے ہم عصروں میں خوشحال خاں خٹک کے علاوہ عبدالقادر خاں، سکندر خاں اور اشرف خاں ہجری بھی تھے جو اپنے دور کے اچھے اور باغی شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ بقول رضا ہمدانی

''رحمان بابا کا کلام عوام میں جتنا مقبول ہے اتنا کسی اور پشتو شاعر کا کلام نہیں۔ ان کی شاعری ہر دل کی ترجمان ہے۔ وہ خود کہتے ہیں ''ساری سڑوبن قوم میں کسی نے ایسی کتاب تخلیق نہیں کی جیسی رحمان کی کتاب ہے''۔

اسلام کو بدنام نہ کریں

پہلے نیک انسان بنیں

بعد میں مسلمان بنیں

تحریک اصلاح معاشرہ پاکستان۔ پوسٹ بکس نمبر 6216 لاہور

افشاں قاضی

اُردو رباعی کا سفر فراق تک

لغوی اعتبار سے رباعی چار مصرعوں کے دو ایسے اشعار کو کہا جاتا ہے۔ جس میں تسلسل کے ساتھ کوئی ایک ہی مضمون باندھا گیا ہو۔ دو شعر جن کا پہلا' دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ تیسرا مصرعہ بھی اگر ہم قافیہ ہو تو جائز ہے۔ رباعی کیلئے کسی مضمون کی بھی قید نہیں۔ عاشقانہ' صوفیانہ' عارفانہ یا سیاسی کوئی بھی مضمون باندھا جاسکتا ہے۔ لیکن اس بات کا خیال لازمی ہے کہ ہر مضمون خواہ کوئی بھی ہو صرف چار مصرعوں میں ادا کیا جائے۔ رباعی شاعری کی ایسی صنف ہے کہ بحر ہزج سے مشتق ہے۔ یعنی "لاحول ولاقوت الا باللہ" کے وزن پر ہوتی ہے۔ لیکن اس میں تمام مصرعوں کا وزن یکساں ہونا ضروری ہے۔

رباعی کی خصوصیت اور اہمیت یہ ہے کہ اس میں بے جا طوالت نہیں ہوتی اور بڑے سے بڑا مضمون صرف چار مصرعوں میں ادا ہو جاتا ہے۔ اس کا اختصار ہی اس کا حسن ہے۔

دیگر اصناف سخن کی طرح رباعی بھی فارسی سے اردو میں آئی۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کو اردو رباعی کا پہلا شاعر کہا جاسکتا ہے کیونکہ ان کے دیوان میں متعدد رباعیاں موجود ہیں۔ ان رباعیوں میں عارفانہ' اخلاقی' حکیمانہ اور عاشقانہ مضامین ملتے ہیں۔ ان کی رباعیوں کا خاص وصف سادگی اور سلاست ہے' کہیں کہیں برج بھاشا اور سنسکرت کے اثرات بھی نظر آتے ہیں اور ساتھ ساتھ فارسی لفظوں اور محاوروں کی آمیزش بھی مثلاً

اب دوست سوں مل بیٹھ کے میں جام منگوں　　اس ہونٹ شکر ایسے تھے میں کام منگوں
آرام دل آرام سے ہے دل کوں سدا　　میں اپنے دل آرام سے آرام منگوں

قلی قطب شاہ کے بعد ولی کے دیوان میں کچھ رباعیاں قابل ذکر ہیں۔ ان کی رباعیاں بھی ادبی محاسن اور بلند فکری سے مالا مال ہیں۔ ان میں حسن وعشق کی کیفیات محبوب کی تصویر کشی' محاکات اور منظر نگاری کے علاوہ کچھ رباعیاں عارفانہ رنگ کی بھی نظر آتی ہیں۔ ان کی ایک رباعی یہ ہے جس میں وہ اپنے محبوب کی تصویر کچھ یوں بناتے ہیں۔

تجھ مکھ کا یہ پھول ہے چمن کی زینت　　تجھ شمع کا شعلہ ہے اگن کی زینت

فردوس میں یہ کس نے اشارے سوں کہا　　یہ نور ہے عالم کے نین کی زینت

میر کے عہد میں بھی رباعی کے فن کی طرف اچھی خاصی توجہ ملتی ہے۔ لیکن یہ توجہ اس نوعیت کی نہ تھی جس سے رباعی کے فن کو زیادہ ترقی ملتی یا اسے عروج حاصل ہوتا۔ تاہم تھوڑی بہت ترقی ضرور ہوئی۔ میر تقی میر کے ہاں سو سے زیادہ رباعیاں ملتی ہیں۔ ان کا انداز بھی میر کی غزلوں کی طرح سادہ اور موثر ہے ان میں نغمگی کی وہ کیفیت کم ہے۔ جو رباعی کیلئے شرط اول ہے۔ لیکن سوز و گداز کی بہر حال کمی نہیں ان کی رباعی کا نمونہ یہ ہے۔

ہر صبح میرے سر پہ قیامت گزری!　　ہر شام نئی ایک مصیبت گزری!

پامال کدورت ہی رہا میں دن رات　　یوں خاک میں ملتے مجھ کو مدت گزری

اسی طرح سودا کے ہاں بھی رباعیات کی اچھی خاصی تعداد ملتی ہے۔ جن کے موضوعات مذہب' عشق' اخلاق' تصوف' مدح' رندی و سرمستی ہیں۔ لیکن ان کے ہاں وہ سوز و گداز نہیں ہے جو میر کے ہاں ملتا ہے۔ اور ان کی رباعیوں کا انداز بیشتر بیانیہ ہے۔ جس میں خیالات اور جذبہ کی گہرائی اور توانائی بھی مفقود ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

ہر چیز جہاں میں کی ہم نے تحقیق!　　ہوتی نہیں ہم سے اردو کی تفریق

اے دل شناوری میں نہ ہو اس کے غرق　　بحر توحید ہے نہایت ہی عمیق

سودا کے بعد اہم شعراء میں درد کا نام آتا ہے۔ جنہوں نے فن رباعی کی طرف توجہ کی۔ ان کی رباعیوں کا خاص وصف' درد' تصوف' عشق حقیقی اور عشق مجازی ہے۔ بیان میں سادگی اور معنوی اعتبار سے گہرا تاثر ہے۔

دیکھا ہے میں نے زندگی کا جب سے سپنا　　جینا ہی سدا ہے مجھ کو نت کھپنا

تقصیر معاف تب ہی ہوگی اے درد　　جوں شمع کروں گا قدم بوس اپنا

میر حسن کے ہاں بھی رباعی کی صنف ملتی ہے۔ مگر یوں لگتا ہے کہ انہوں نے اس طرف خاص دلچسپی نہیں لی۔ اس لئے ان کے کلام میں رباعی کی تعداد بہت کم ہے۔ تاہم جتنی بھی ہیں ان سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اگر وہ ادھر زیادہ توجہ کرتے تو اردو رباعیات میں یقیناً قابل قدر اضافہ ہوتا۔ دلی کی بربادی کے بعد جب شعراء نے لکھنؤ کا رخ کیا تو وہاں سے علم و ادب کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس دور کے تقریباً ہر شاعر کے ہاں شاعری کی دوسری اصناف کے ساتھ ساتھ رباعی پر بھی طبع آزمائی ملتی ہے۔ اس دور کے جن مشہور شعراء

نے اس فن کو برتا ان میں انشاء' جرات' مصحفی شامل ہیں۔ اس عہد میں سب سے زیادہ رباعیات' جرات کے ہاں نظر آتی ہیں۔ ان کی رباعیات کا رنگ وہی ہے جو ان کی غزلوں کا ہے۔ معاملہ بندی' شوخی' چھیڑ چھاڑ اور چونچلوں کا انداز' معاملہ بندی کی حیثیت سے جن جذبات کا اظہار ان کی غزلوں یا رباعیات میں ہے۔ ان کی سچائی سے انکار ممکن نہیں۔ اپنی مخصوص حدود میں ان کی صداقت مسلم ہے اور اسی وجہ سے جرات اپنے عہد میں رباعی نگار کی حیثیت سے بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کی رباعی کا نمونہ یہ ہے۔

طفلی نہ رہے گی نہ جوانی باقی! نے پیری و نے زندگانی باقی
القصہ نہ صرف کر بہ غفلت اوقات رہ جائے گی آخر اک کہانی باقی

یا

دیکھا جو کل اس نے میرے جی کا کھونا اور کھینچ کے آہ سرد ہر دم رونا
منہ پھیر کے مسکرائے چپکے سے کہا آسان نہیں کسی پہ عاشق ہونا

تاہم انیس' دبیر' غالب' مومن اور ذوق وغیرہ کا دور رباعی کیلئے ایک اہم دور ہے۔ ان تمام شعراء نے نہ صرف غزل' قصیدہ اور مرثیہ کو عروج بخشا بلکہ رباعی کے فن کو بھی خوب ترقی دی۔ یہ تمام شعراء لکھنؤ اور دہلی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے ان دونوں مرکزوں میں رباعی کے فن کو عروج ملا' خصوصیت سے انیس و دبیر نے رباعی پر سب سے زیادہ توجہ کی اور اس صنف کو بھی دوسری اصناف کی طرح اہم اور قابل قدر بنا دیا اور رباعی کے مخصوص مضامین میں توسیع ہو کر اس میں واقعات کربلا' صبر و شکر' صداقت کردار' وفاداری' محبت' جانثاری غرض انسانی زندگی کے بلند ترین اور عظیم ترین احساسات اور اقدار رباعی میں سمٹ آئیں۔

انیس کے کلام میں تقریباً پانچ سو اور دبیر کے کلام میں تقریباً دو سو رباعیات ہیں۔ ان رباعیوں میں صداقت' جذبات' احساسات کی شدت' روانی' سلاست بیان جیسی خوبیاں بہت زیادہ ہیں۔ انیس کی رباعی کا نمونہ یہ ہے۔

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں یا معدن کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر سو تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

انیس و دبیر کی کوششوں نے رباعی کی صنف کو مجلس اور عوام سے روشناس کرایا۔ جس کے تحت ان شعراء نے بھی رباعی کی طرف توجہ دی جو اس صنف کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ دہلی میں غالب' ذوق' مومن'

ظفر اور شیفتہ جیسے بڑے اور قادر الکلام شاعر تھے۔ لیکن ان لوگوں نے بھی غزل کی طرف اپنی مکمل توجہ مرکوز رکھی اور رباعی پر خاص توجہ نہ دی۔ غالب کے دیوان میں بہت کم رباعیات ہیں جن کے موضوعات حمد و نعت بادشاہ وقت کی مدح (بہادر شاہ ظفر) اور غم روزگار کے شکوے پر مبنی ہیں۔ ان کے کلام میں جو وسعت اور فکری بلندی ہے وہ انکی رباعیات میں مفقود ہیں۔ بلکہ غالب کی رباعیات سے بہتر ذوق کی رباعیات ہیں۔ ان میں زبان کی حلاوت' سادگی' روزمرہ اور محاورہ بندی کا حسن ہے۔ اس کے بعد اسی دور میں مومن کے ہاں بھی رباعیاں نظر آتی ہیں جو تعداد میں تقریباً ایک سو چالیس ہیں۔ مومن کی رباعیات' نازک خیالی' مضمون آفرینی' واردات قلبی اور معنوی خصوصیات کے سبب غالب اور ذوق کی رباعیات پر فوقیت رکھتی ہیں۔ حالانکہ غزل اور قصیدے کے اعتبار سے وہ ان دونوں کے مرتبہ تک نہیں پہنچے۔ مومن کی رباعی کا نمونہ یہ ہے۔

ہے عہد شباب زندگانی کا مزا   پیری کہاں وہ نوجوانی کا مزا
اب یہ بھی کوئی دن میں فسانہ ہوگا   باتوں میں جو باقی ہے کہانی کا مزا

حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ میں رباعی کے فن کو زیادہ تقویت اس وقت ملی جب وہاں مرثیہ کا دور شروع ہوا۔ اور انیس و دبیر نے اس طرف خاص توجہ کی۔ ان اصحاب نے واقعات کربلا کو صرف امام حسینؓ کی شہادت کے بیان تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ اپنی رباعیات کے ذریعے اس سانحہ کو انسانیت کیلئے ایک عظیم درس بنا دیا۔ اسی وجہ سے حالی اور اکبر کی توجہ خاص طور پر اس صنف کی طرف مبذول ہوگئی۔ کیونکہ یہ دونوں اس دور میں قومی اور ادبی مصلحین میں صف اول کے رہنما تھے۔ انہوں نے اس صنف سخن کو اپنے اصلاحی مشن کی ترویج کیلئے برتا۔ خصوصیت سے حالی نے اس صنف کو بہت ترقی دی۔ اور تمام اخلاقی' سیاسی اور اصلاحی موضوعات اس صنف کے ذریعے بیان کئے۔ قومی اور وطنی احساس' قوم کی زبوں حالی کا احساس' انسانی رشتوں کا لحاظ' امن سے ہمدردی حالی کی رباعیات کا خاص موضوع ہیں۔ ان کی رباعیوں میں حسن و عشق کا احساس اور سوز و گداز کم اور ناصحانہ انداز زیادہ ہے۔ مثلاً

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے   اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے جذر کے بعد   دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اکبر کی رباعیات کا بھی وہی ناصحانہ رنگ ہے جو حالی کے ہاں نظر آتا ہے لیکن لہجوں کا فرق ہے۔ حالی کا لہجہ سنجیدہ ہے اور اکبر کے لہجہ میں طنز و ظرافت جھلکتی ہے۔

ان کے علاوہ اسمٰعیل میرٹھی، امیر مینائی، پیارے صاحب رشید نے بھی اپنے اپنے مخصوص رنگ میں رباعیاں کہیں۔ اسمٰعیل میرٹھی کے ہاں حالی اور اکبر کی آواز کی گونج ہے۔ پیارے صاحب رشید اپنے استاد انیس کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں اور امیر مینائی کی زیادہ تر رباعیات نعتیہ ہیں۔ غزل کے مشہور شاعر شاد عظیم آبادی نے بھی رباعی کے فن کو استعمال کیا۔ ان کی رباعیوں میں عارفانہ رنگ نمایاں ہے۔

بعد کے دور میں رباعی کہنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ چنانچہ ان شعراء کے اس دور کو رباعی کیلئے اہم دور قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس دور کے اہم رباعی گو شعراء میں جوش، فانی، سیماب، فراق اور یگانہ وغیرہ اہم ہیں۔ فانی کے کلیات میں بھی دو سو کے قریب رباعیات ہیں۔ ان کی رباعیوں میں بھی ان کا وہی مخصوص لب ولہجہ نمایاں ہے جو ان کی غزلوں کا رنگ خاص ہے۔ مایوسی، بے دلی، بے زاری، موت کی تمنا، زندگی سے نفرت، گھٹن اور تاریکی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی رباعیوں میں تغزل ہے۔ مثلاً یہ رباعی

بجھتی ہی نہیں شمع جلے جاتی ہے! کٹتی ہی نہیں رات ڈھلے جاتی ہے
جاری ہے نفس کی آمد وشد فانی سینے میں چھری ہے کہ چلے جاتی ہے

ان کے علاوہ تلوک چند محروم، جگت موہن لعل رواں، عبدالباری آسی کے نام بھی اہم رباعی نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ یگانہ کے ہاں بھی رباعیات کی اچھی خاصی تعداد ہے جن میں ان کے لہجہ کی خود اعتمادی، جوش، چیلنج کرنے والا انداز، ہنگامہ خیزی، جذبہ کی شدت اور زندگی کی توانائی ہے۔ ان کے مجموعہ کلام گنجینہ میں ایک سو تریسٹھ رباعیات شامل ہیں۔

اثر صہبائی بھی اہم رباعی نگار ہیں۔ ان کی رباعیوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ رباعی گو شعراء میں امجد حیدر آبادی بھی ایک اہم اور نمایاں رباعی گو ہیں کیونکہ انہوں نے رباعی کی صنف کو اپنے لئے مخصوص کرلیا۔ ان کے ہاں اس فن کی جو پختگی ملتی ہے وہ کسی دوسرے کے ہاں نہیں ہے۔ ان کی رباعیات کے موضوعات میں توحید، تصوف، عشق حقیقی اور عرفان ہیں۔ عشق حقیقی کا سرور و کیف ان کی رباعیات کا خاص وصف ہے۔ ان کی رباعی کا نمونہ یہ ہے۔

ہیں مست شہود تو بھی میں بھی! ہیں مدعی نمود تو بھی میں بھی!!
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں ممکن نہیں دو دو وجود تو بھی میں بھی

جوش اور فراق کے بھی اس صنف سخن پر بہت احسان ہیں۔ لیکن یہ دونوں نظم اور غزل کے شاعر پہلے

ہیں اور رباعی کے بعد میں۔ جوش نے شاعری کی ابتداء غزل سے کی۔ بعد میں نظم کیلئے اپنے فن کو مخصوص کیا۔ اور آخر میں رباعی کے فن کو اپنا لیا۔ جوش کے ہاں الفاظ کی شان و شوکت' تاثر کی وحدت' بیان میں زور' تسلسل خیال ہے۔ یہی چیزیں رباعی کے فن کو عروج کی منزلوں تک پہنچاتی ہیں۔ اسی وجہ سے جوش نظم کے ساتھ ساتھ رباعی کے فن میں بھی ایک مرتبہ رکھتے ہیں۔ جوش کی رباعی کا نمونہ یہ ہے۔

ساقی کا بہر رنگ نظارہ کرلوں!! مرتے مرتے بھی اک اشارہ کرلوں
آدم کا میں ناخلف ہوں فرزندا ے جوش عصیاں سے بھی اگر کنارہ کرلوں

فراق کا رباعی کا وصف خاص حسن و عشق' جمالیاتی کیف و سرور ہے۔ ان کی رباعیوں میں خوبصورت اور حسین بت نظر آتے ہیں۔ مجسمہ سازی ان کا خاص انداز ہے اور ہندو ثقافت اور تہذیب کے انداز حسن کی جھلک ان کی رباعیوں کو حسن دوام بخشتی نظر آتی ہے۔

نمونہ کلام

اس میں ڈوبی تو اور نکھری شوخی ڈھل کے شبنم سے جیسے کھلتی ہو کلی
معصوم ہے کتنی روٹھ جانے کی ادا آنکھوں میں سرشک اور ہونٹوں پہ ہنسی

اردو رباعی گو شعراء کے اہم ناموں میں سید ضمیر جعفری کا نام سرفہرست ہے جنہوں نے فکاہیہ انداز میں سیاسی اور معاشرتی حوالوں سے بدنظمی اور لاقانونیت کو پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ رئیس امروہوی' انور شعور اور دیگر شعراء نے رباعی کی صنف میں خاص نام پیدا کیا ہے جس کیلئے ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے کیونکہ بعد کے بعض رباعی گو شعراء موضوع کی وسعت' تنوع' فنی اور تکنیکی رویون کے اعتبار سے قدما سے بہت آگے ہیں۔

عبدالحمید اعظمی

قدیم فارسی شعراء کے دواوین

حافظ شیرازی کی ایک مشہور غزل ہے، جس کا مطلع ہے:

ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمری بینم　　ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شری بینم

برصغیر میں جتنے بھی دیوان شائع ہوئے ہیں ان میں یہ غزل موجود ہے لیکن طہران سے شائع شدہ دیوانِ حافظ کا ایک نسخہ میرے کرمفرما اور دوست ڈاکٹر محمد صدیق شبلی نے مجھے عنایت فرمایا، جس میں یہ غزل سرے سے درج نہیں ہے۔ ناشر نے اس نسخہ کی تحقیق کے بعد دیگر نسخوں کی تصحیح کا بھی دعویٰ کیا ہے اور اضافہ پر بھی توجہ مبذول کرائی ہے۔ "پیش گفتار" کے آغاز میں لکھتے ہیں:۔

"۔۔۔۔ با تہیہ و انتشار نسخہ ای دیگر بہ نسخ ما قبل افزودہ در معرضِ استفادہ علاقمندان قرار دہیم و در اجرائے ایں امر حد اکثر کوشش و تحقیق را نمودیم کہ با مطالعہ مداقہ و کامل بہ نشریات قبلی متکے بہ نظریات مختلف اساتید نسبت بہ تغیر و تبدل برخی از لغات و کلمات و عناوین چکیدہ ای از متون اصلاح شدہ منتہی بہ اتحاد و اتفاق نظر را انتخاب و در دیوان منعکس سازیم۔"

اسی لئے دیوان کو دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور الجھن بھی۔ بر سبیل تذکرہ ایک خط میں ڈاکٹر الیاس عشقی سے اس الجھن کا ذکر کیا اور مذکورہ غزل کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی۔ ان کا جواب نہ صرف حافظ بلکہ ایران کے تمام کلاسیکی فارسی شعراء کے دواوین کے معتبر یا غیر معتبر مکمل یا نامکمل ہونے کے سوال پر بحث طلب موضوع کی صورت میں سامنے آیا ہے ان ہی کے الفاظ میں اس کا متن اہل علم کی توجہ کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر الیاس عشقی لکھتے ہیں:

"یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کا مجھ سے زمانہ طالب علمی سے تعلق رہا ہے جب جدید فارسی پہلی بار نصاب میں داخل ہوئی تھی۔ اور یہ عنوان برصغیر میں فارسی ادب کے آخری دور کا ایسا اختلافی مسئلہ ہے، جس پر ایرانی اور ہندوستانی شعراء اور ادباء کا اختلاف رہا ہے۔ ایرانیوں کو اپنی زبان پر کچھ زیادہ ہی فخر ہے اور ہم کیا کہ اب دو سو سال سے فارسی زبان و ادب سے ہمارا وہ تعلق نہیں ہے جو کبھی تھا۔ ایران کے لوگ تو ان ملکوں اور قوموں

کی زبان کو نہیں مانتے فارسی جن کی مادری زبان ہے مثلاً افغانستان' سویت یونین سے آزاد ہونے والی چھ ریاستیں' دراصل ایرانیوں کو اپنی زبان کا نشہ زیادہ ہی چڑھ گیا ہے اور نشے میں آدمی کی بات کا کیا بھروسہ۔ پہلے مجھے غصہ آتا تھا۔ اس موضوع پر ایرانی شاعر شیخ علی حزیں اور سراج الدین علی خان آرزو کے درمیان اختلاف کا علم تھا' علی حزیں کو ہندوستان کے فارسی شعراء اور ادباء نے بڑی عزت دی' سید ہونے کی وجہ سے احترام مزید کیا۔ شعر کی داد بھی دی شکر گزاری تو رہی ایک طرف وہ یہاں کے لوگوں سے نفرت کرتا تھا اور کسی کو فارسی شاعر ماننے کو تیار نہ تھا۔ زبانی اختلاف تو ہوا تحریری بھی ہوا' اور اس سلسلہ میں خان آرزو کی کتاب ''تنبیہ الغافلین'' اور دو ایک اور رسالے قابل دید ہیں۔ ایرانیوں کا عام رجحان یہ ہے مگر مہذب لوگ' یہی بات نرم لہجے میں لپیٹ کر کرتے ہیں۔ ہماری فارسی کو فارسی نہیں مانتے اور کہتے ہیں ان میں الحاقی کلام زیادہ ہے اس بات کا فیصلہ کیسے ہو۔ اس لئے کہ تنقید نام کی کوئی شے ایران میں نہ تھی۔ تعریف اور تنقیص تھی۔ اب تنقید شروع ہوئی ہے تو کچھ دن میں بات سمجھنے لگیں گے۔ ان کے علما میں ہمارے معیار کا صرف ایک عالم تھا' علی محمد قزوینی' اور وہ اس لئے کہ اس کی تعلیم بمبئی میں ہوئی تھی۔ وہ دیگر ممالک میں بھی رہا' اس کا کام بھی قابل قدر ہے۔ بین الاقوامی معیار کا ہے' اس کے بعد بڑے بڑے ایرانی علماء میں ملک الشعراء بہار' دہخدا' بدیع الزمان' فروزاں فر، اور سعید نفیسی وغیرہ ہیں۔ لیکن ملا کی دوڑ مسجد تک۔ فارسی زبان سے شروع ہو کر اسی پر رکے ہوئے ہیں' جیسے کوئی داغ اور امیر کی شاعری کا ہو کر رہ جائے۔ جدید شعراء اب واقعی اچھا کہہ رہے ہیں اور تنقید سے بھی واقف معلوم ہوتے ہیں۔ فارسی غزل نے جو ترقی کی ہندوستان میں کی۔ عرفی نظیری نے مضمون آفرینی اور تازہ گوئی کی داغ بیل ڈالی۔ ایرانی سمجھتے نہیں ہیں اور اسے ''سبک ہندی'' کہہ کر ٹال جاتے ہیں۔ دراصل سمجھتے نہیں کہ یہ رنگِ کلام ہندوستان کی دین ہے۔ چنانچہ شعراء کے بہترین دیوان شائع کرتے ہیں اور ان کا کلام سمجھتے نہیں۔ اپنی کلاسیکی شاعری کو خود نہیں سمجھتے۔ جو لفظ نہیں جانتے عظیم شعراء کے کلام میں بدل دیتے ہیں اور شائع کر دیتے ہیں۔ ایک اور مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ قدیم ترین خطی نسخے کو معتبر سمجھتے ہیں اور بعد کے نسخوں کو کم معتبر جانتے ہیں۔ ''شئے لطیف'' کی اس قدر کمی ہے کہ یہی نہیں جانتے کہ قدیم شعراء رومی اور حافظ' سعدی قلم دوات لے کر اپنا کلام نہیں کہتے تھے۔ وہ شعر کہتے تھے اہل ذوق یاد کرتے تھے عقیدت مند لکھ لیتے۔ ایسے لوگ دوسرے شہروں سے بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ اور کلام جمع کر کے دیوان مرتب کر لیتے تھے۔ جسے جتنا کلام ملا اس نے اسے دیوان میں جمع کر لیا۔ شعراء کا کلام ناپید رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور غزلیات کی

تعداد کم زیادہ ہوتی گئی۔ اور شعراء کے انتقال کے بعد لوگوں نے زیادہ سے زیادہ قلمی یا خطی نسخے جمع کر کے دیوان اور کلیات مرتب کئے۔ لیکن یہ قدیم نسخے پر کے ہیں حالانکہ شاعران دواوین کے بعد بھی زندہ رہے اور شاعری کرتے رہے۔ وہ ہندوستان کے دواوین کو نہیں مانتے' حالانکہ یہی دواوین ایران میں ہندوستان کے شائع شدہ دواوین کا سن کر نولکشور کی اشاعتوں سے نقل کئے' یہ خطی نسخوں کا فتور بعد کا ہے' اسے سو سال بھی نہیں ہوئے' اس لئے جس غزل کو آپ ایران کے مطبوعہ دیوان میں نہیں پاتے وہ حافظ ہی کی ہے۔

سب سے زیادہ گھپلا خیام کے کلام کا ہے اس کے غیر معتبر کلام میں تقریباً تین ہزار رباعیاں ہیں مگر یہ کلام اس کا نہیں ہے۔ قدیم کلام میں ۱۵۰۰ رباعیاں ہیں ۱۵ معتبر ترین نسخوں میں ایران' ہندوستان' انگلستان' فرانس اور جرمنی کے ہیں زیادہ سے زیادہ ۸۰۰ سے کچھ اوپر رباعیات ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی رباعیات ۳۰۰ سے زیادہ نہیں' باقی رباعیات دوسرے شعراء کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ یہ وہ رباعیاں ہیں جو سفر میں رہتی ہیں۔ ان کے متعلق روسی محقق روکوسکی نے Wandering Quartrain کے نام سے تحقیق کی ہے اور ہمارے یہاں بھی تحقیق ہوئی ہے' ایران کا جو قدیم ترین نسخہ رباعیات عمر خیام کا ہے اس میں وہ رباعیاں نہیں ہیں جو اس کی پہچان ہیں۔ خیال فرمائے اس سے قبل ایرانی ہندوستانی اور دوسرے احمق تھے جو ان رباعیات کو خیام کے نام سے منسوب کرتے رہے جو اس کی نہ تھیں۔ یہی بات غزلیات حافظ پر بھی صادق آتی ہے۔

ہندوستان میں لغت کا کام زیادہ ہوا ہے' ہماری لغات معیاری ہیں مگر ایرانی انہیں معتبر نہیں جانتے۔ وہ کتابیں اچھی چھاپتے ہیں اور کتابوں کے مقدمے لکھنے کا فن تھوڑا سیکھ بھی لیا ہے مگر ڈاکٹر معین نے جو ماہر لغت ہے ہندوستانی لغات پر بغیر پڑھے مقدمہ لکھ دیا اور جو لغت خود مرتب کی ہے خاصی ضخیم ہے' اس میں کلاسیکی فارسی الفاظ نہیں ہیں اس لئے کہ وہ ہندوستان کی لغات میں شامل ہیں۔ سند میں ایرانی شعراء کے شعر پیش کئے گئے ہیں۔ اسی جذبہ کے تحت ایرانی شعراء کے دیوان شائع کئے جاتے ہیں۔ اس معاملے میں میری بحث ایران کے چند اساتذہ اور ادباء سے ہوئی ہے میں نے انہیں قائل کر لیا ہے۔"

ڈاکٹر الیاس عشقی نے جن نکات کی نشاندہی کی ہے وہ اس لائق ہیں کہ اس علاقے کے فارسی شعر و ادب کے مورخ ان پر مفصل اور مدلل بحث بھی کریں اور تاریخ ادبیات فارسی میں اس کا ذکر بھی نمایاں طور پر کریں۔

"صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے"

میاں غلام قادر

گوئٹے کی داستانِ عشق

حافظؒ اور کلامِ حافظ کو مختلف ادوار میں لسان الغیب کا درجہ حاصل رہا ہے مگر المانوی شاعر یوحان ولف گانگ فان گوئٹے نے شعر حافظ سے پیغام رسانی کا کام لیا اور اس میں سرخ رو رہے۔ ہوا یوں کہ:

۱۸۱۲ء میں جرمن دانشور ''یوسف فان ہامر'' نے خواجہ شمس الدین حافظؒ کے دیوان کا مکمل جرمن ترجمہ شائع کیا۔ یہ جرمن ترجمہ ۱۸۱۴ء میں گوئٹے کے زیر مطالعہ آیا تو ان کی گویا دنیا ہی بدل گئی۔ ان کی پوری شاعری خواجہ حافظؒ کے رنگ میں رنگی گئی اور وہ اب خود کو ''بلبل شیراز'' اور شیراز کو اپنا ''شہر آرزو'' سمجھنے لگے!

۱۸۱۴ء میں ہی گوئٹے وائمر سے ''ویزباڈن'' کے سفر پر روانہ ہوئے۔ وہاں انہوں نے اپنے ایک بینکر دوست ''یعقوب فان وِلے مر'' کے ہاں قیام کیا۔ حُسنِ اتفاق سے ان کی ملاقات ایک خاتون ''نے ینگ'' سے ہوئی جو حسین و جمیل ہونے کے علاوہ شعر و شاعری کی بھی دلدادہ تھی اور اس نے گوئٹے کا اکثر کلام پڑھا تھا۔ دراصل ''نے ینگ'' بیلے ڈانسر تھی اور آسٹریا نژزاد۔ وہ ''وِلے مر'' کے گھر میں ان کی صاحبزادیوں کے ساتھ پلی بڑھی تھی۔ جب یعقوب خان وِلے مر کی بیوی فوت ہوئی تو وہ **Nee Jung** سے **Marianne Von Willemer** (ماریانے فان وِلے مر) بن گئی۔ گوئٹے نے ماریانے کو ادب اور دیگر فنون کا دلدادہ پایا تو اس کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے۔ ماریانے سخن فہم ہونے کے ساتھ ساتھ سخن ور بھی تھی۔ گوئٹے سے اب اس کی باقاعدہ خط و کتابت شروع ہوگئی۔

۱۸۱۵ء میں گوئٹے نے ''جرمن دیوان'' کے نام سے اپنی ۵۰ نظمیں شائع کیں۔ دیوان حافظ کے مطالعے کے بعد گوئٹے نے حافظؒ کی پیروی میں نظمیں لکھنی شروع کی تھیں۔ ۱۸۱۹ء میں گوئٹے کا ''دیوان شرق و غرب'' چھپا تو انہوں نے اس میں 1915ء والے ''جرمن دیوان'' کی نظمیں بھی شائع کیں۔ ''دیوان شرق و غرب'' میں ایک طویل باب ''زلیخا نامہ'' کے نام سے شامل ہے۔ اور بعض اہل الرائے کہتے ہیں کہ اس باب میں ماریانے کی لکھی چند خوبصورت نظمیں بھی شامل ہیں۔ دراصل دیوان حافظؒ کے مطالعہ کے بعد گوئٹے نے اپنا طرز تخاطب یکسر بدل دیا تھا۔ وہ بیشتر نظموں میں خود کو ''یوسف'' یا ''حاتم'' اور ماریانے کو ''زلیخا'' کہتے اور

یوں یہ "یوسف زلیخا" کی داستان، داستانِ عشق میں بدل گئی۔

گوئٹے نے دیوان حافظ کو پیغام رسانی کیلئے کیونکر استعمال کیا یہ داستان بڑی دلچسپ ہے۔ انہوں نے "دیوان حافظ" کا ہو بہو ایک دوسرا نسخہ "ماریانے فان ولےمر" کو مہیا کیا اور باہم یہ قرار پایا کہ "حالِ دل" کے اظہار کیلئے بجائے اس کے کہ روایتی زبان استعمال ہو کیوں نہ "لسان الغیب" سے کام لیا جائے۔ چنانچہ ماریانے سے جو خط موصول ہوتا اس میں صرف ۱۳/۵۰ یا ۶/۷ قسم کے اعداد درج ہوتے اور جوابی خط بھی ۳۲/۴ یا ۹۹/۲ کے ہندسوں پر مشتمل ہوتا۔ مقصد ان اعداد سے یہ ہوتا کہ دیکھئے صفحہ ۳۲ شعر نمبر ۴ اور ملاحظہ فرمایئے، صفحہ نمبر ۹۹ شعر نمبر ۲۔ کہئے آپ کو ان عشاق کا یہ طریقۂ واردات پسند آیا؟ معلوم نہیں تاریخ میں اور بھی ایسے عشاق گزرے ہیں یا نہیں جنہوں نے کبوتروں کے بجائے علم ہندسہ سے کام لے کر عشق فرمایا ہو!

یادش بخیر، گوئٹے کا ذکر کرتے کرتے ہمیں اپنے سناتن دھرم ہائی سکول نوشہرہ کے اردو کے استاد جناب پنڈت گیتی رام یاد آ گئے جنہوں نے سرحد کے طلباء میں اردو زبان کا صحیح ذوق پیدا کیا۔ پنڈت جی جب کبھی ترنگ میں ہوتے "مری بار کیوں دیر اتنی کری" لہک لہک کر گاتے اور سکول کی پوری فضا میں ایک ایسا جادو کا سا اثر گھول دیتے کہ سامعین پر نشہ سا طاری ہو جاتا۔ وہ اکثر جی ٹی روڈ کے کنارے والے چمن میں کرسی ڈال کر طلباء کو نیم دائرے کی شکل میں اپنے سامنے بٹھاتے۔ جماعت کا ایک خوبرو مگر غبی طالب علم چمن لال ان کا ہدف خاص بنتا۔ وہ کتاب کھولنے سے پہلے درس کی ابتدا کسی عجیب وغریب شعر سے کرتے اور اس قدر بلند آواز اور نسوانی ترنم سے اشعار پڑھتے کہ باہر جی ٹی روڈ پر تماش بینوں کا مجمع لگ جاتا۔ ایسے میں پنڈت جی چمن لال سے مخاطب ہو کر پوچھتے: چمن جی!

خط کبوتر کس طرح لے جائے بام یار پر　　　پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر

چمن لال بے چارہ جو خیر آباد کے ایک سرمایہ دار کا بیٹا تھا وہ ایسی معصوم صورت بناتا گویا کہہ رہا ہو:

"پنڈت جی! ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں؟"

ماسٹر گیتی رام چمن لال کی جانب سے مایوس ہو کر خود ہی جواب دیتے: برخوردار!

خط کبوتر اس طرح لے جائے بام یار پر　　　خط تو لکھا ہو پروں پر، پر کٹیں دیوار پر!

دیکھئے! شرق وغرب کے عشاق پیغام رسانی کے کیا کیا انوکھے طریقے اختیار کرتے ہیں!

نوید ظفر

پشاور

صوبہ سرحد کا صدر مقام پشاور ہے۔ پشاور شہر کی تاریخ بڑی قدیم ہے' لیکن یہ اپنی قدامت اور ثقافت کو برقرار رکھتے ہوئے جدید دور میں داخل ہوا۔ یونانی مورخ ھیری دوتس Heredotas نے اس شہر کا نام پش کاپوریس Pushkapures بیان کیا ہے۔ چوتھی صدی عیسوی میں چینی سیاح فاھیان نے اس شہر کو پولیوسہا Poleusaha رقم کیا ہے' ساتویں صدی میں ھیون سانگ اسے پولوشپولے Pulushapule پکارتا ہے دسویں اور گیارہویں صدی میں عہد غزنوی کے مورخین مسعودی اور البیرونی نے اسے پرشاور تحریر کیا ہے' عہد اکبر میں ابوالفضل اسے پشاور کے موجودہ نام سے آئین اکبری میں درج کرتا ہے اور یہی نام گزشتہ پانچ سو برس سے استعمال میں ہے۔

پشاور شہر کوہ ہندوکش سلسلے کی ایک منفرد وادی میں واقع ہے' جس کے ایک طرف ۴۵۴۵ فٹ بلند چراٹ کا خوشگوار موضع ہے' دوسری طرف دریائے کابل کے ساتھ ۳۷۰۷ فٹ بلند غمباہان اور ۶۷۴۷ فٹ بلند پاجا اور ۹۳۲۹ فٹ بلند الم پہاڑ کی چوٹیاں ہیں' یہ پہاڑ اپنی چوٹیوں سے بتدریج کم ہوتے ہوئے مردان کے قریب تخت بھائی تک پہنچتے پہنچتے صرف ۱۸۲۳ فٹ رہ جاتے ہیں' تاہم پشاور شہر نہ صرف خود تاریخ کے کئی ہزار برس کا زمانہ دیکھ چکا ہے بلکہ اس کے گرد و نواح کا ایک ایک ذرہ بدھ اور کشان دور سے لے کر دورِ حاضر تک اقتدار اور زوال کی کتنی ہی داستانوں کا چشم دید گواہ ہے۔

تاریخی درہ خیبر سے صرف ۱۵ کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے بدنی اور دریائے کابل سے منسلک دریائے باڑہ کے درمیان ایک تکون کے اندر پشاور شہر قدیم تاریخ کا اولین مکین ہے۔ انیسویں صدی کے انگریز شاعر اور ناول نگار رڈیارڈ کپلنگ پشاور شہر کے بارے میں تحریر کرتا ہے۔

ترجمہ: ''جب موسم بہار کی ہوا خشک زمین میں سبزہ بکھیر دیتی ہے۔ ہمارے کاروان خیبر کے درے میں سے گذرتے ہیں کمزور اونٹوں پر بھاری سامان' ہلکی جیبیں' بھاری توشہ دان' جب شمال کے برف پوش پہاڑوں سے تجارتی سامان جنوب کی طرف اترتا ہے۔''

پشاور شہر کی منڈیاں بھر جاتی ہیں۔

پشاور شہر اپنی قدیم شکل میں ایک قلعہ نما شہر تھا' جس کے چاروں طرف دیوار تھی اور اس دیوار میں متعدد دروازے تھے جن میں سے کم از کم سولہ کے بارے میں آثار موجود ہیں' پاکستان میں پشاور کے علاوہ لاہور کے بارہ دروازوں کے آثار بھی موجود ہیں۔

پشاور شہر آزادی کے بعد جس تیزی سے پھیلا' اس کے سبب وہ اپنی دیواروں سے باہر نکل کر کئی گنا وسیع ہو گیا ہے' تاہم اب بھی قدیم دیواروں اور دروازوں کے آثار ملتے ہیں' بالخصوص جنوب کی جانب گنج دروازہ کے ساتھ قدیم عہد کی دیوار' ڈبگری باغ کی جانب سے دیکھی جا سکتی ہے۔

شہر کے قدیم دروازوں میں یکا توت دروازہ مارچ ۱۹۴۴ء میں دوبارہ تعمیر کروایا گیا تھا' تاکہ دوسری جنگ عظیم کے دوران روسی افواج کا شہر میں داخلے کا خطرہ روکا جا سکے۔ یکا توت سے مشرق کی جانب لاہوری دروازہ ہے جس کا رخ جرنیلی سڑک کے ذریعہ لاہور کی جانب ہے' ان دونوں دروازوں کے درمیان شیخ آبادی آبادی اور ایک تیسرا دروازہ گنج دروازہ ہے جو ۱۹۰۹ء میں دوبارہ تعمیر ہوا۔ یہاں مشہور درویش شیخ جنید کی درگاہ اور حاظر خوانی کا قدیم قبرستان بھی موجود ہے۔ جہاں مغل عہد کی بعض قبہ دار قبریں اور مزارات موجود ہیں۔

لاہوری دروازے سے مشرق کی جانب ہشت نگری دروازہ تھا۔ جہاں ایک زمانے میں لکڑی گودام نام کی آبادی تھی اور عیدالفطر کے موقع پر جھنڈوں کا میلہ منایا جاتا تھا۔ اب یہاں نشتر آباد کی آبادی پھیل رہی ہے' ہشت نگری کا دروازہ بھی اب نابود ہو چکا ہے۔

ہشت نگری سے مشرق کی جانب مزید بڑھیں تو شہر کی قدیم دیوار اکثر مقامات پر ختم ہو چکی ہے یا گھروں اور دکانوں کا حصہ بن چکی ہے' یہاں تک کہ ہم رام پورہ دروازہ تک پہنچتے ہیں' جسے نواں دروازہ بھی کہا جاتا ہے۔ رام پورہ دروازے کے ساتھ ملحق آبادی کا قدیم نام بھی رام پورہ تھا' تاہم رام پورہ کی قدیم آبادی سے دروازے کے مشرق میں دیوار کے بارے میں کوئی آثار نہیں ملتے۔ یہاں تک کہ ہم ریتی دروازے تک پہنچتے ہیں' ایک زمانے میں یہاں لوہاروں کا مرکز ہوتا تھا۔ یہاں سے آگے ٹکسالی دروازہ ہے جسے کچہری دروازہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس دروازے کے سامنے پشاور شہر کا مشہور چوک یادگار ہے جسے ۱۹۳۰ء میں انگریزوں کی فائرنگ کی وجہ سے خصوصی اہمیت حاصل ہوئی تھی۔ یہ یادگار اصل میں ۱۸۸۴ء میں کرنل ہیسٹنگز کی یادگار کے طور پر انگریزوں نے تعمیر کی تھی۔ یہاں انگریزی فارسی اور پشتو میں تحریر تھا کہ یہ یادگار دو دسمبر ۱۸۸۴ء کو کرنل

ہیسٹنگز کی یادگار کے طور پر انگریزوں نے تعمیر کی تھی۔ یہاں انگریزی' فارسی اور پشتو میں تحریر تھا کہ یہ یادگار ۲ دسمبر ۱۸۸۴ء کو کرنل ہیسٹنگز کی موت پر ان کے ایک ہزار دو بستوں اور مداحوں نے تعمیر کیا' جن میں سے آٹھ سو کا تعلق پشاور ڈسٹرکٹ سے تھا۔ تاہم وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ یادگار سیاسی جلسوں کا مرکز بن گئی' ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد یہاں پاکستانی شہیدوں کی یادگار تعمیر کی گئی۔

کچہری دروازہ کے بعد ہم آٹھویں دروازے اسامائی یا اندرون شہر دروازہ تک پہنچتے ہیں۔ راستے میں کہیں کہیں قدیم دیوار کے آثار بھی ملتے ہیں' اس دروازے کے باہر لیڈی ریڈنگ ہسپتال قائم ہے' شہر کی دیوار ڈھکی نالبندی کے علاقہ سے گذر کر کابلی دروازے تک پہنچتی ہے' کابلی دروازے کا نام بدل کر انگریزی عہد میں ایڈورڈ گیٹ رکھ دیا گیا تھا۔ تاہم اب اس دروازے کے آثار بھی نہیں ملتے۔

کابلی گیٹ کے بعد باجوڑی دروازہ تھا' یہ دروازہ بھی اب معدوم ہو چکا ہے۔ باجوڑی دروازے کے بعد ڈبگری دروازہ تھا جس کا صرف ایک ستون مخدوش حالت میں موجود ہے۔ یہاں سے آگے رام داس دروازہ تھا' جس کے بعد ایک محراب کی شکل میں سراسیا دروازہ ہے' سراسیا دروازے کے بعد سرد چاہ دروازہ ۱۹۰۳ء میں تعمیر ہوا تھا۔ سرد چاہ کے بعد سرا کی دروازہ اور آخر میں سولہواں اور آخری دروازہ کوہاٹی دروازہ ہے جس کے متصل سلطان یار محمد کی حویلی تھی۔ یہاں مشن ہائی سکول تعمیر کر دیا گیا تھا۔

شہر کی دیوار اور تاریخی دروازوں کے علاوہ پشاور شہر میں نوادرات اور قدیم عمارات کا ایک طویل سلسلہ ہے' اس سلسلہ میں سب سے بلند اور قابل توجہ بالا حصار کا قلعہ ہے' قلعہ ۹۲ فٹ بلند ٹیلہ پر تعمیر ہے۔ یہ قلعہ کئی دفعہ تعمیر اور تباہی کے مراحل سے گذرا۔ آخری دفعہ اسے سکھوں نے ۱۸۳۲ء میں تباہ کیا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے ۱۸۳۴ء میں تعمیر کروایا گیا۔

بالا حصار قلعہ کے علاوہ شہر کی اہم ترین عمارت گورکھتری ہے' جو چوک یادگار یا ہشت نگری دروازے کے ذریعہ نظر آتی ہے۔ یہ عمارت ''گوتم بدھ کے کشکول'' کے حوالے سے مشہور رہی ہے۔ اور اس عمارت کے بارے میں کئی روایات ہیں' ایک روایت کے مطابق گوتم بدھ جب اپنی روح کے گیان کے سفر میں تھے' ان کے سامنے ایک برتن تھا' جس میں گذرنے والے لوگ کھانا یا کوئی رقم رکھ جاتے تھے۔ یہ برتن گورکھتری کے مقام پر محفوظ کیا گیا' بعد میں ایک بادشاہ اس برتن کو اٹھانے آیا تو روایات کے مطابق ہاتھی اس برتن کو نہ اٹھا سکا۔ بالاخر یہاں پر وہ برتن مختلف مذہبی عمارات کی تعمیر کے ساتھ محفوظ کر دیا گیا۔ تاہم آج ایسے کسی برتن کے

یہاں پر آثار نہیں۔ البتہ ایک زمانے میں ہندو اور بدھ سادھو یہاں عبادت کیلئے اکٹھے ہوتے رہے ہیں۔ اکبر اور جہانگیر بادشاہ کا بھی ان عمارات میں حاضری کا پتہ ملتا ہے' شاہجہان کے عہد میں شاہجہان کی بیٹی جہان آرا نے یہاں پر ایک سرائے حمام اور ایک مسجد تعمیر کروائی اس نسبت سے گورکھتری جہان آباد کے نام سے مشہور ہوئی۔ تاہم سکھوں کے عہد میں مسجد مسمار کر کے گورکھ ناتھ کا مندر تعمیر کر دیا گیا تھا۔ سکھوں کے خلاف مجاہدین کی جنگ آزادی کے دوران یہ عمارت سید احمد شہید کے مرکزی دفتر کے طور پر بھی استعمال میں رہی۔

پشاور کے اہم تاریخی مقامات میں شاہ جی کی ڈھیری کا حوالہ بھی موجود ہے۔ گنج گیٹ سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر حاضر خوانی سڑک کے ذریعہ اس ڈھیری تک پہنچا جا سکتا ہے۔ قدیم روایات کے مطابق یہاں کشان عہد کا خزانہ یا بدھ دور کے بعض قیمتی نوادرات تھے۔ چنانچہ انگریزی عہد میں اس مقام کو تین دفعہ کھودا گیا۔ لیکن یہاں سے صرف ایک چھوٹا سا بت اور پیتل کا بنا ہوا عہد کنشک کا ایک نمونہ جس پر بادشاہ کنشک اور بنانے والے کا نام اجے سلوس درج ہے' برآمد ہوا' اب یہ جگہ مٹی کے ایک ڈھیر کی صورت میں موجود ہے اور یہاں سے برآمد ہونے والے نوادرات پشاور کے عجائب گھر میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں' پشاور کی دیگر اہم عمارات میں مہابت خان کی تعمیر کردہ ایک مسجد ہے' مہابت خان اورنگزیب بادشاہ کے زمانے میں صوبہ کا حکمران تھا۔ مسجد لاہور کی بادشاہی مسجد کا نمونہ ہے' اس مسجد کے دو مینار ۱۱۰ فٹ ہیں' ان دو میناروں کے درمیان چھ مزید چھوٹے مینار ہیں۔

ڈبگری دروازے کی جانب نواب سید خان کا مقبرہ بھی ایک اہم تاریخی عمارت ہے' نواب سید خان کابل کا گورنر تھا اور اس کا انتقال ۱۶۵۱ عیسوی میں عہد شاہجہان میں ہوا تھا۔ یہ مزار مغلیہ فن تعمیر کا ایک اہم نمونہ تھا۔ اس کے چاروں جانب چہار باغ کی شکل میں باغات پھیلے ہوئے تھے۔ تاہم عہد انگریزی میں قبر کا سنگ مرمر تعویز عمارت کے درمیان سے ہٹا کر یہاں ایک گرجا گھر کا اہتمام کیا گیا جو آج بھی موجود ہے' مقبرہ کی چار دیواری میں مشن سکول برائے طلباء و طالبات اور مشن ہسپتال بھی تعمیر کیا گیا' عمارت کے اندر ایک تختی پر درج ہے کہ یہ عمارت QVO کور کے کمانڈر جنرل سر ہیری لمسڈن کے صدر مقام کے طور پر ۱۸۵۱ـ۱۸۴۹ء کے دوران استعمال میں رہی۔

سرد چاہ گیٹ کے قریب ''وزیر باغ'' پشاور کا ایک مشہور باغ تھا جو عہد درانی میں تعمیر ہوا' اس باغ کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ پشاور میں پنج تیرہ کا آشرم ہندوؤں کے لئے مقدس مقام تصور کیا جاتا ہے جر تیلی

سڑک پر کھجوروں کے جھنڈ کے درمیان اس جگہ کو بدھ مت کے پیروکار بھی مقدس تصور کرتے ہیں اوران کے عقیدے کے مطابق بدھ عہد کے بعض مقدس برتن یہاں دفن رہے ہیں۔ یہاں پر پانچ تالاب ہیں' جہاں ہندو اور بدھ مت کے پیروکار نہاتے ہیں اور اپنے عقیدے کے مطابق گناہوں سے صفائی پا جاتے ہیں' ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ان پانچ تالابوں کا تعلق پانچ پانڈو بھائیوں سے ہے' جو مہا بھارت کی روایات کے مطابق کوروؤں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئے۔

پشاور شہر میں اسلامیہ کالج مشہور تاریخی درسگاہ اور عمارت ہے جس کا نقش کرنسی نوٹوں پر بھی موجود ہے' ڈاکٹر دانی کی تحقیق کے مطابق اس درس گاہ کو علی گڑھ کے مقابلے پر تعمیر کروایا گیا تھا۔ تاکہ مسلمان اپنا چندہ علی گڑھ بھیجنے کے بجائے اس درس گاہ کی جانب ترسیل کرسکیں۔ تاہم اس درس گاہ نے پشاور شہر میں علم پھیلانے میں نمایاں کام کیا۔ ۱۹۱۱ء میں سر جارج راس کیپل نے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ تاہم مسلمانوں کی تعلیم کی طرف مائل کرنے کیلئے حاجی صاحب ترنگزئی نے بھی یہاں پر ایک پتھر اپنے ہاتھ سے نصب کیا۔

اپریل ۱۹۴۸ء میں اپنے دورہ کے دوران قائداعظم محمد علی جناح نے اس کالج کو یونیورسٹی بنانے کا اعلان کیا اور ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو پاکستان کے پہلے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان نے باضابطہ سنگ بنیاد رکھ کر یونیورسٹی کی تعلیم کا آغاز کیا۔

پشاور شہر اپنی تاریخی عمارات اور روایات کے ساتھ ساتھ قصہ خوانی بازار کے حوالے سے بھی مشہور ہے۔ وسطی ایشیا کی مشہور منڈی ہونے کے حوالے سے تاجکستان' قزاقستان' افغانستان' پاکستان اور دیگر ایشیائی کاروان یہاں سے گذرتے اور پڑاؤ کرتے۔ قصہ خوانی بازار میں قسم قسم کی داستانیں بیان کرنے والے قصہ خوان اکٹھے ہوجاتے' مسافر قہوہ پیتے اور تمام رات ان کے قصے سنتے۔ قصہ خوانی بازار آج بھی اپنی سرائیں' پیتل اور چاندی کے کام اور قہوہ خانوں کے سبب مشہور ہے۔

پشاور سے منسوب علاقائی لوک کہانیوں میں یوسف کڑہ مار کی داستان سب سے مشہور ہے' یوسف کڑہ مار ترلاندی گاؤں کے سردار حسین کا کا کا بیٹا تھا اور یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ خوبصورتی' گھڑ سواری اور شکار میں اپنی مثال آپ تھا۔ ایک دفعہ شکار کے لئے جاتے ہوئے سکندر آباد کے گاؤں میں شہر بانو کے حسن کا خود شکار ہوگیا۔ شہر بانو کے والدین خود سکندر آباد کے ملک تھے' رشتہ ہر اعتبار سے برابری کا تھا۔ تاہم جب یوسف کے والدین نے شیر بانو کے لئے رشتہ طلب کیا تو شیر بانو کے والدین نے اپنے قبیلے کے مشورے

سے مہر میں یوسف کے والدین سے اتنی رقم طلب کی، جو وہ ادا نہ کر سکتے تھے۔

یوسف نے ہمت نہ ہاری اور وہ علاقہ چھوڑ کر اکبر اعظم کی فوج میں ملازمت کرنے دلی چلا گیا۔ یوسف کی عدم موجودگی میں یوسف کے والد کا انتقال ہو گیا اور یوسف کی بہن اور والدہ کو برادری نے بے دخل کر دیا۔ دوسری طرف شہر بانو کے لئے اس کے چچا کے بیٹے نے رشتہ بھیجا جو منظور کر لیا گیا۔ ادھر یوسف نے اکبر اعظم کی فوج میں اپنی بہادری اور اعلیٰ کردار کی جانب بڑا نام پیدا کر کے واپسی کا فیصلہ کیا۔

جب وہ اپنے گھر واپس پہنچا تو اس کی ملاقات اپنی بہن سے ہوئی، جس نے اسے بتایا کہ سکندر آباد میں شہر بانو کی شادی ہو رہی ہے، یوسف جواب شاہی فوج کا ایک امیر تھا، اپنے حفاظتی دستے کے ساتھ سکندر آباد پہنچا اور عین شادی کے موقع پر اپنی دلہن کا طلبگار ہوا۔

شہر بانو کی شادی اپنے چچا کے بیٹے کے بجائے یوسف سے طے پا گئی۔ شہر بانو اور یوسف نے اپنی شادی کا زمانہ نہایت خوشی سے گذارا۔ تاہم کچھ عرصہ بعد شہر بانو کا انتقال ہو گیا۔ یوسف دنیا سے کنارہ کش ہو کر شہر بانو کی قبر کا مجاور بن گیا۔ اور ہر وقت بلند آواز سے شہر بانو کے عشق میں گیت اور ٹپے بیان کرتا۔ یوسف کے انتقال کے بعد اسے شہر بانو کی قبر کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ یوسف اور شہر بانو کی محبت کے سبب سکندر آباد اب شہر غونڈہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس حوالے سے پشتو زبان میں کئی فلمیں بن چکی ہیں۔

پشاور شہر جس کی ابتداء کی ایک کہانی پیپل کا ایک مقدس درخت بھی تھا جس کی بعض روایات میں ۲۵۰۰ برس عمر بیان کی گئی ہے اور جس کے سائے میں گوتم بدھ کو بیٹھنے کی نسبت بھی تھی، بابر نے اپنی تزک میں اس درخت کا خصوصی حوالہ دیا ہے، کئی تاریخی اتار چڑھاؤ گذارنے کے بعد اب ایک جدید شہر کے طور پر تیزی سے ترقی کے مراحل طے کر رہا ہے، صوبائی دارالحکومت ہونے کے سبب یہاں پر صوبائی اسمبلی، عدالتی مراکز، تعلیمی، صنعتی اور ہر نوعیت کے ہنر مند لوگ عزت اور سر بلندی حاصل کرتے ہیں، شہر کی قدیم عمارات میں بازار کلاں میں سیٹھوں کی حویلیاں شہرت کی خصوصی حامل ہیں۔ تاہم شہر میں قدیم عمارات، تہہ خانے اور پرانے برج والی عمارات کی کمی نہیں۔ قدیم عمارات سے دلچسپی رکھنے والے زائرین پشاور اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔

انشائیہ

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

لکیریں

یہ واحد سڑک ہے جو میرے گھر سے دفتر کو جاتی ہے۔اس کی لمبائی دو فرلانگ سے زیادہ نہیں۔ میں اس دو فرلانگ لکیر پر پچیس برس سے چل رہا ہوں لیکن یہ چھوٹی سی لکیر ختم نہیں ہوسکی۔ جب میں اسے ایک سرے تک طے کر لیتا ہوں تو یہ پھر شروع ہو جاتی ہے۔ جب میں اس کے دوسرے سرے کو چھوتا ہوں تو وہاں سے یہ دوبارہ پہلے سرے کی طرف انگشت نما ہو جاتی ہے۔ یہ لکیر میرے سفر نے میرے پاؤں تلے بچھادی ہے اور اس نے مجھے ایک زنجیر کی طرح جکڑ لیا ہے۔ سڑک اور لکیر' اس خیال نے میرے ذہن میں بہت سی سڑکیں بچھادی ہیں۔ ہر سڑک ایک لکیر ہے جس پر ہر مسافر اپنا سفر طے کر رہا ہے۔ چھوٹی' لمبی' سیدھی' ٹیڑھی' ترچھی لکیریں جنہیں سب طے کر رہے ہیں لیکن کسی لکیر کا آخری سرا کہیں نظر نہیں آتا۔ ایک سرے پر پہنچ کر ہر لکیر سانپ کی طرح بل کھاتی اور پلٹ جاتی ہے۔ سانپ بھی تو لکیریں ہی ہیں۔ بعض مسافروں کو ان لکیروں پر بھی چلنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھار کوئی لکیر اپنے مسافر کو ڈس لیتی ہے لیکن دوسرا مسافر اس کا زہر چوس لیتا ہے تاکہ وہ پھر چل پڑے اور چلتا رہے کیوں کہ لکیر کا آخری سرا کہیں نہیں ہے۔

سڑک' مسافر اور سانپ' کہیں ان سب کی حقیقت لکیر ہی نہ ہو۔ ان کی شکلیں مختلف ہونے کے سبب ہم نے ان کے نام الگ الگ رکھ دیئے ہوں ورنہ سڑک سڑک نہ ہو' سانپ سانپ نہ ہو۔ یہ ممکن ہے کہ سڑک نے اپنا کولتار لکیر کے جسم میں انڈیل دیا ہو اور سانپ نے اپنا زہر لکیر کی رگوں میں بھر دیا ہو۔ اور جب مسافر لکیر پر چل رہا ہو تو لکیر اس کے پاؤں میں آبلے ڈال رہی ہو اور وہ چل رہا ہو' سلگ رہا ہو' زہر آلود ہو رہا ہو اور چلنے پر مجبور ہو کیونکہ اسے لکیر کے آخری سرے تک چلنا ہے اور لکیر کا آخری سرا کہیں نہیں ہے۔

میں نے سڑک کو لکیر کیوں سمجھا؟ میں نے اپنے ذہن میں جھانکا۔ اپنے تحت الشعور کو ٹٹولا۔ تب مجھے اپنی اس ذہنی افتاد کا سراغ مل گیا۔ میں جب پہلی بار مکتب میں گیا تھا تو مجھے میاں جی نے کہا تھا ''کہو بیٹا الف''۔ میں نے کہا ''الف''۔ تب انہوں نے قلم سے تختی پر ایک سیدھی لکیر کھینچ دی اور کہا ''دیکھو ایسا ہوتا ہے الف''۔ تب میں نے دل میں سوچا یہ تو ایک سیدھی لکیر ہے۔ اسے میاں جی لکیر کیوں نہیں کہتے۔ میرے ذہن

نے ان کے علم سے سمجھوتہ نہیں کیا میں نے بے یقینی کے عالم میں دبی زبان سے کہا ''الف''۔ میرے ذہن نے چپکے سے میرے کان میں کہا ''لکیر'' میرا ذہن مجھ پر چھانے لگا۔ مجھے قلم بھی لکیر لگا۔ الف بھی لکیر۔ لیکن میں نے ایک لکیر کو الف کہا دوسری لکیر کو قلم کیونکہ ایک موٹی سی لکیر میاں جی کے دائیں ہاتھ میں لہرا رہی تھی اور اس کا رخ میری کھوپڑی کی طرف تھا۔ پھر میاں جی نے مجھے اور دوسرے حروف' الفاظ اور ترکیبی الفاظ سکھائے اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے لکھائی کا سارا عمل سیدھی' ترچھی' لمبی' چھوٹی لکیروں کا تانا بانا ہے۔ پھر میں نے اس سوچ کی عینک سے پوری کائنات کا مشاہدہ کر ڈالا۔

درختوں کے تنے' شاخیں' پانی کی لہریں' بہتے ہوئے دریا' اڑتی ہوئی ہوائیں' عمارتوں کے ستون' بانسری کی پور' سارنگی کے تار' مصور کا برش' استاد کا چاک' ادیب کا قلم' سپاہی کی تلوار' انسانوں اور حیوانوں کے ہاتھ' انگلیاں' ٹانگیں' مجھے یہ سب کا سب لکیروں کا عمل بافت محسوس ہوا۔ میں نے دو فرلانگ کی سڑک کے حوالے سے پوری کائنات کو سیدھی اور ٹیڑھی لکیروں کی نمائش گاہ سمجھا۔ مجھے انسانی زندگی میں یہ لکیریں اپنے نکیلے پنجے گاڑے محسوس ہوئیں۔ میں نے ایک لڑکی سے محبت کی۔ اس نے اپنے باپ سے کہہ دیا۔ اس کے باپ نے مجھے ناک سے پکڑا اور کہا ''جھکو اور ناک سے سات لکیریں زمین پر کھینچو''...... میں نے سات کی بجائے نو لکیریں کھینچیں اور اس کے بعد ایک دن میں اس لڑکی کو اپنے ہاتھ کی لکیر پر سجا کر اپنے گھر لے آیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ہاتھ کی لکیر ایک سڑک ہے اور وہ ڈولی میں بیٹھ کر اس سڑک کو طے کر رہی ہے۔ وہ لڑکی خود سر سے پاؤں تک ایک باریک اور سیدھی لکیر تھی۔ پھر اس نے چھ سال میں چھ لکیروں کو جنم دیا۔ ٹیڑھی لکیریں! وہ ان ٹیڑھی لکیروں کو جنم دینے پر مجبور تھی کیونکہ ایک نجومی نے میرے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر کہا تھا کہ تمہارے چھ بچے ہوں گے۔ تب میرے ہاتھ کی لکیروں نے زور باندھا اور جس لکیر کو میں ڈولی میں بٹھا کر لایا تھا' اس نے اپنی سیدھی لکیر میں چھ ٹیڑھی لکیریں جوڑ کر ایک لمبی لکیر میرے سامنے بچھا دی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ معاشی لکیروں کے علاوہ معاشرتی اور سماجی لکیریں بھی انسان کے قدموں کے سامنے دور تک بچھی ہوئی ہیں۔ میں ان لکیروں پر چلتے چلتے تھک گیا ہوں۔ میرے پاؤں سے لہو رس رہا ہے۔ لیکن میں دو فرلانگ کی اس لکیر پر جو میرے گھر سے دفتر کو جاتی ہے اور ان سات لکیروں پر جو میرے گھر میں رینگ رہی ہیں برابر چل رہا ہوں۔

مجھے ایک اور تجربہ بھی ہوا کہ جب پاؤں سے لہو رستا ہے تو انگ انگ میں لذت سی بھر جاتی ہے۔ کہیں زندگی انہی سیدھی اور ٹیڑھی لکیروں سے تو عبارت نہیں؟ میں سوچتا ہوں لاؤ کسی لکیر کو مٹا ڈالوں۔ دو فرلانگ لمبی لکیر کو مٹا ڈالوں' میاں جی کے لکھے ہوئے الف کو مٹا ڈالوں' لیکن الف لکھے جاتے رہیں گے تاکہ ان سے علم اور ادب اور فن تخلیق ہو اور سڑکیں بنتی رہیں گی تاکہ تعمیر اور تہذیب اور ارتقا کا سفر جاری رہے۔ اور

ہاتھوں کی لکیریں ذہنوں میں خراشیں ڈالتی رہیں گی تاکہ رسم ورواج اور تمدن کے نقوش گہرے ہوتے چلے جائیں۔انہی لکیروں سے مصوری کے نقش ونگار ابھرتے رہیں گے۔انہی لکیروں سے ریاضی کے فارمولے ہمکتے رہیں گے اور انہی لکیروں سے ادبی روایتیں جنم لیتی رہیں گی۔کچھ لوگ کہتے ہیں "ادب کی پرانی لکیریں مٹادو اور نئی لکیریں کھینچ دو"۔پرانی لکیریں اس لئے مٹادو کہ وہ سیدھی لکیریں ہیں اور وہ گھوڑے جن کی آنکھوں پر اندھیریاں ہوتی ہیں وہی سیدھی لکیریں بناتے ہیں۔سوان سیدھی لکیروں کو مٹادو کہ وہ ایک ہی سیدھ میں دیکھنے والے گھوڑوں کے سفر کا نتیجہ ہیں۔کچھ لوگ کہتے ہیں، روایت کی صرف ٹیڑھی لکیروں کو مٹادو...... لیکن سیدھی لکیریں اس لئے رہنی چاہئیں کہ انسان کے ذہن کے تجربے ان میں ٹیڑھی لکیروں کا اضافہ کردیں اور ٹیڑھی لکیریں اس لئے رہنی ضروری ہیں کہ ان کے وجود سے راستی کا احساس جنم لے اور ہم سیدھی لکیر کھینچ کر اس فرق کو واضح کرسکیں جو سیدھی اور ٹیڑھی لکیر میں ہے۔سب سیدھی اور ٹیڑھی لکیریں ذہنی تجربے ہیں اور ذہنی تجربوں کا تسلسل ضروری ہے۔اگر تم ساری پرانی لکیریں مٹا ڈالو گے تب بھی تم لکیروں کے جال سے نہیں نکل سکتے۔تمہیں خود بھی تو لکیریں کھینچنی پڑیں گی۔پھر تمہارے بعد کوئی اور اٹھے گا اور وہ تمہاری نئی لکیریں مٹادے گا کیونکہ وہ بھی روایت کا حصہ بن چکی ہوں گی۔

ادب کے ناظر کے سامنے لکیروں کا پورا عمل رہنے دو' تاکہ تجربوں کی رفتار اور معیار کے سارے خطوط محفوظ رہیں۔تم کس کس لکیر کو کہاں کہاں سے مٹاؤ گے۔میں دو فرلانگ کی حقیری لکیر نہیں مٹا سکا اور ادب کی لکیر کا پہلا سرا تو آسمان کی اس بلندی سے شروع ہوتا ہے جہاں سے شاعر کا ذہن الہام وصول کرتا ہے اور مصور کا ذہن تصویر کا بنیادی خیال اڑاتا ہے اور فنکار کا ذہن رنگ اور خوشبو اور آگہی کا نور حاصل کرتا ہے میں نے اسے عقیدے کے طور پر قبول کرلیا ہے کہ انسان کے دماغ میں لکیروں کا ایک گچھا ہے۔وہ ایک ایک لکیر نکالتا ہے اور علم وفن' تہذیب وتمدن اور تخلیق وتعمیر کے خطوط مرتب کرتا ہے۔شاید ان سب لکیروں کے جال سے رہائی حاصل کی جاسکتی ہو...... معاشی لکیریں' معاشرتی لکیریں' ادبی لکیریں اپنی ذات کے اندر کی لکیریں اور اپنی ذات سے باہر کی لکیریں ان سب سے نجات ممکن ہے۔ان لکیروں کو طے کرنا بہت سہل ہے۔اپنے اختیار کی بات ہے۔لیکن معاً ذہن میں سوچ کی ایک لکیر ابھری۔زندگی......؟ زندگی تو ازل سے ابد تک ایک لامتناہی لکیر ہے اور اس لکیر کو خدا نے خود اپنے ہاتھ سے کھینچا ہے۔تب میں اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔دو فرلانگ کی نکیلی لکیر سے میرے پاؤں زخمی تھے۔زخموں سے لہو رس رہا تھا اور لہو کا نمکین ذائقہ میری روح میں اس طرح اتر رہا تھا جیسے پھول کی رگوں میں شبنم کے قطرے!!

خاکہ

یادرفتگاں

ڈاکٹر محمد معز الدین

پروفیسر سید وقار عظیمؒ ۔۔۔ عظمت واستقامت کا پیکر

پروفیسر وقار عظیم ایک جامع الصفات انسان تھے۔ ان کے ذکر سے ہی ان کی وہ دلکش، سنجیدہ اور سراپا شفقت شخصیت سامنے آتی ہے جس میں علم کا تدبر، تجربے کی پختگی، محبت اور شائستگی کا بلند معیار نظر آتا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں ملنے والوں کو ان سے قربت کا احساس ہونے لگتا تھا۔ انگریزی کا محاورہ To know him was to love him ان پر پورے طور پر صادق آتا تھا۔

پروفیسر موصوف کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب میں کالج کے ابتدائی درجوں میں تھا، ان کی کتاب افسانے کی تکنیک پر بازار میں آئی تھی۔ یہ ۴۳-۱۹۴۲ء میں اس فن پر اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلی کتاب تھی اس کے بعد اور کتابیں اس مضمون پر آئیں مگر طلبہ اور اساتذہ سب ہی اس سے استفادہ کرتے تھے۔ یہ ایک نادر تصنیف تھی۔ پھر پروفیسر کلیم الدین احمد کی کتاب ''فن داستان گوئی'' بہت مقبول ہوئی اور ڈاکٹر گیان چند کی کتاب ''اردو کی نثری داستانیں'' آئی۔ اس زمانے میں پروفیسر وقار عظیم کے مسلسل مضامین اس موضوع پر شائع ہو رہے تھے۔ جن میں داستانوں سے افسانوں تک ہمارے قدیم سرمایۂ ادب کا تفصیلی جائزہ لیا گیا تھا۔ یہ مضامین جب کتابی شکل میں یکجا ہوئے تو ان کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ ہوا۔ غرضیکہ اس فن پر آج بھی افسانے کی تکنیک پر ان کا مطالعہ سند کا درجہ رکھتا ہے۔

اس کے بعد ''ماہ نو'' کے مدیر کی حیثیت سے ان کے مضامین پڑھتا رہا، وہ دور ''ماہ نو'' کے ماہ کامل بننے کا دور تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ آپ نے صحافت کو خیرآباد کہہ کر اورنٹیل کالج لاہور میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے درس وتدریس کی ذمہ داری سنبھال لی ہے اور یہ اپنی پرانی دلچسپی کی طرف لوٹ آئے۔ یہاں آکر جس تندہی، لگن، خلوص اور استقلال سے انہوں نے اپنے فرائض انجام دیئے وہ ان کے شاگردوں اور احباب کو معلوم ہے۔ ان کی اعلیٰ کارکردگی اور ادبی خدمات کا صلہ تھا کہ 'غالب پروفیسر' کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ غرضیکہ اردو کے صاحب طرز ادیب، نقاد، خوبصورت نثر نگار اور بہترین مترجم کی حیثیت سے دنیائے ادب میں اپنا ایک مقام حاصل کر لیا، اقبال شناسی میں بھی ان کی کتاب 'اقبال بہ حیثیت شاعر' کافی مقبول ہوئی۔

ان کے چھوٹے بھائی اقبال عظیم بھی صاحب طرز شاعر تھے۔ ان کے مجموعۂ کلام 'مضراب' کا دیباچہ پروفیسر وقار عظیم نے تحریر فرمایا جس سے ان کے تبحر علمی، دیانت داری اور متوازن طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

پروفیسر وقار عظیم کو زیادہ قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع ۱۹۷۰ء میں ڈھاکہ میں ملا۔ یہ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایم اے (اردو) کے طالب علموں کا زبانی امتحان (Viva Voce) لینے آئے تھے۔ وہاں کی سیاسی فضا سخت مسموم تھی۔ بدقسمتی سے وہاں بہاری بنگالی فساد پھوٹ پڑا تھا۔ راستے مخدوش، لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے تھے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید ڈھاکہ نہ جاتا مگر پروفیسر صاحب جو ڈھاکہ کی گلی کوچوں سے بھی واقف نہ تھے۔ ٹھیک وقت پر نہایت اطمینان وسکون سے شعبۂ اردو میں موجود تھے۔ ہم لوگ یونیورسٹی کیمپس میں رہتے تھے لہٰذا ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ یہ اپنے بھائی پروفیسر اقبال عظیم کے سرکاری فلیٹ میں قیام پذیر تھے۔ وہ علاقہ زیادہ محفوظ نہ تھا۔ ان کے اس احساس ذمہ داری سے میں بہت متاثر ہوا۔ شعبۂ اردو کے اساتذہ نے بھی حیرانی کا اظہار کیا اور کہا کہ اس حالت میں آپ کو ڈھاکہ کا سفر نہیں کرنا تھا۔ آپ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ "آخر شاگردوں کی بھی تو جان ہے"۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ کسی کو پتہ نہ تھا کہ کل کیا ہوگا۔ مگر ان کی مستعدی، استقامت اور احساس ذمہ داری کو دیکھ کر ہمارے بھی حوصلے بڑھے۔ اب واپسی کا سوال تھا۔ سواری ندارد۔ میں نے درخواست کی کہ ادھر ہی قیام کیجئے۔ مگر یہ نہ مانے۔ میں ڈرتے ڈرتے اپنی گاڑی نکال لایا۔ یہ ہمارے مہمان تھے۔ ان کی حفاظت ہمارا فرض تھا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کار میں خاموشی سے بیٹھے رہیں اگر خدانخواستہ کسی جانب سے حملہ ہوا تو میں بجائے اردو کے بنگلہ زبان میں بات کرنیکی کوشش کرونگا' اللہ کے فضل سے محفوظ پہنچ گئے۔ فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ دوسرے روز بھی ان کو لانے کا پروگرام تھا۔ جیسے میں نے دستک دی۔ دیکھا کہ یہ تیار بیٹھے تھے۔ مجھے ایک منٹ بھی انتظار نہ کرنا پڑا۔ چہرے سے کسی قسم کی گھبراہٹ یا خوف کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ اطمینان سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ شعبے میں آ کر طلبہ کا انتظار کرتے رہے۔ جو طالب علم پہلے دن نہ آسکے تھے وہ ڈرتے ڈرتے آگئے تھے۔ امتحان کے بعد طلبہ کا حوصلہ بڑھانے کے لئے مختصر سی تقریر بھی کی۔ ایک ایک لفظ سے خوداعتمادی مترشح تھی۔ اللہ پر بھروسا اور نامساعد حالات سے مقابلہ کرنے کی تلقین کی جیسے کہہ رہے ہوں کہ

ع اگر خواہی حیات اندر خطر زی (اقبال)

حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے۔ دوسرے دن بھی پانچ بجے شام سے کرفیو لگنا تھا۔ میں انہیں اپنی گاڑی

میں وقت سے کچھ پہلے ایئر پورٹ چھوڑ آیا۔ رخصت ہوتے ہوئے جس شفقت اور تشکر سے گلے ملے۔ اس کا لمس میں اب بھی محسوس کرتا ہوں۔ ان سے ملنے کا یہ رسمی موقع خلوص و یگانگت میں بدل چکا تھا۔ اس وقت ہم سب بے حد سراسیمہ تھے۔ پتہ نہ تھا کہ آگے ہماری منزل کہاں تھی۔ قوم کا کیا بنے گا۔ ہماری زبان' ہماری ثقافت اور پاکستان کا کیا بنے گا۔ رخصت ہوتے وقت اتنا یاد ہے کہ یہ کہہ رہے تھے' حوصلہ رکھیئے' آزمائش اور ابتلا کا دور گزر جاتا ہے۔ اس کے بعد مشرقی پاکستان پر جو قیامت ٹوٹی اور جس شکست و ریخت سے ہم گزرے وہ ایک الگ خونچکاں داستان ہے۔ ان آنکھوں نے کیسی کیسی سازشیں دیکھیں۔ قتل و خون دیکھے اور سرکوبی کے مناظر دیکھے اور بالآخر ؎ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

تاریخ کا ایک باب ختم ہوتا ہے تو دوسرا باب شروع ہوتا ہے۔ شب تار کے سینے سے صبح صادق طلوع ہوتی ہے۔ ہماری قومی تاریخ نے بھی پلٹا کھایا۔ اب ہم نئے راستے پر گامزن تھے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد ستم ہائے روزگار سے مقابلہ کرتے ہوئے مصائب و آلام کے دور سے گزرتے ہوئے کراچی میں پناہ لی۔ اس دوران میں لاہور جانا ہوا تو پروفیسر وقار عظیم سے ملنے ان کے گھر گیا۔ بڑی گرمجوشی سے ملے' اپنی پُر امید باتوں سے دلجوئی کرتے رہے اور تسلی دیتے رہے۔ اس سے چند ماہ پہلے جب میں لاہور گیا تھا تو مزار اقبالؒ پر فاتحہ پڑھنے گیا۔ ہاتھ اٹھتے ہی سارے جسم میں رعشہ سا پیدا ہوا اور ایسا محسوس ہوا کہ میں جس عظیم ہستی کے سامنے کھڑا ہوں وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔ دل کی عجیب کیفیت ہوئی۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ کلام اقبال سے دل کی سرشاری کا احساس تو تھا ہی روح میں سما جانے والی اس آسودۂ خاک شخصیت کا کرشمہ بھی دیکھا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد مجھے بفضلہٖ تعالٰی علامہ اقبالؒ کے کلام و پیغام کی ترویج و اشاعت کا سنہری موقع نصیب ہوا۔ میں اقبال اکادمی' کراچی سے بطور ڈائریکٹر منسلک ہوگیا۔ اس ادارے سے وابستہ ہوتے ہی پروفیسر وقار عظیم سے قربت کا موقع حاصل ہوگیا۔ اقبال اکادمی کے خازن ڈاکٹر نذیر احمد کا یکایک حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اس جگہ پر پروفیسر وقار عظیم کو خازن مقرر کردیا گیا۔ ادارہ کراچی میں اور وہ لاہور میں۔ کئی بار مجلس منتظمہ کی میٹنگ میں شرکت کیلئے آئے۔ اس وقت ان کی معارف پروری' رواداری' عنایت و شفقت کے جوہر سامنے آئے۔ فیصلے دوٹوک' بات کھری' مشورے صائب' صاف ذہن' صاف قلب اور روشن دماغ کے مالک تھے۔

حکومت پاکستان نے تقریباً دو سال کے بعد علامہ اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر

اقبال اکادمی کو کراچی سے لاہور منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس منتقلی میں کئی دشوار منزلیں آئیں مگر پروفیسر صاحب کے مفید اور صائب مشوروں اور ان کی عملی کوششوں سے یہ تمام مراحل خوش اسلوبی سے انجام پا گئے اور اکادمی مستقلاً لاہور منتقل ہوگئی۔ پروفیسر صاحب سے اکثر ملاقاتیں ہوتیں تقریباً ہر روز ٹیلیفون پر باتیں ہوتیں۔ میں وقت بے وقت اکادمی کے سلسلے میں انہیں زحمت دیتا۔ کبھی بے وقت فون پر میں معذرت کرتا تو وہ اس طرح نرمی اور خندہ پیشانی سے جواب دیتے "میں ہر وقت تیار ہوں' آخر ذاتی کام تو نہیں"۔ میں ان کے اخلاق اور مستعدی سے حیران ہوتا کہ اس قدر لکھنے پڑھنے میں مصروف رہنے اور کمزور صحت کے باوجود وہ ہمہ وقت مستعد و معاون ہوتے۔ جب کبھی حاضر ہوتا مسکراتا چہرہ سامنے ہوتا۔ بجز علمی' ادبی اور ادارے کی ترقی کے گفتگو کا اور کوئی موضوع نہ ہوتا۔ نہ کبھی کوئی شکایت نہ کسی کا گلہ' دراصل وہ سب پر مہربان تھے اور اسی لئے زمانہ ان کا قدردان تھا۔

میں جب لاہور آیا تو تنہا آیا پھر چند دنوں کے بعد صرف میرا چھوٹا بیٹا میرے پاس آیا۔ دو عیدیں آئیں اصرار کر کے مجھے اور میرے لڑکے کو گھر بلوالیا۔ نماز ادا کرنے کے بعد ملنے جلنے کا سلسلہ رہا۔ پھر دسترخوان بچھا اور مجھے اور میرے بچے کو گھر سے دوری کا احساس تک نہ ہونے دیا اور وہ اکثر گھر بھی ٹیلیفون کر کے خیریت دریافت کرتے۔ آدمی جب قریب ہوتا ہے تو احساس نہیں ہوتا اگر بچھڑ جاتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ کیا کچھ کھو دیا۔ ع ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

جیسے کہا جاتا ہے کہ آدمی اگر کسی کے ساتھ سفر کرے تو اس کو اس کے اخلاق و عادات کے مطالعے کا موقع ملتا ہے' مجھے دو تین بار ان کے ساتھ اسلام آباد تک ہوائی سفر کا موقع ملا۔ ایک بار صوفی تبسم صاحب بھی ساتھ تھے۔ اتفاق سے ہوائی سفر میں موسم کی خرابی سے سخت تکلیف ہوئی۔ میں نڈھال ہوگیا۔ میرے برابر پروفیسر صاحب تشریف فرما تھے۔ جہاز ہچکولے کھاتا رہا' ہم زندگی اور موت کے درمیان جھولتے رہے' مگر ان کے چہرے پر ایسا سکون واطمینان تھا کہ جیسے منزل سامنے ہے۔ گھبرانا کیسا' بعد از خرابیٔ بسیار جہاز اپنے مستقر پر اترا تو میں نے معذرت کی کہ مجھے افسوس ہے کہ میں برداشت نہ کر سکا' طبیعت مالش کرتی رہی اور الٹی ہوگئی۔ یقیناً آپ کو تکلیف ہوئی ہوگی۔ کہنے لگے۔ نہیں' مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی زیادہ مدد نہ کر سکا۔ (وہ ہمیشہ آپ سے مخاطب کرتے)۔ ایک بار ٹرین کے سفر میں ہماری نشست دور تھی۔ صوفی صاحب اور یہ برابر بیٹھے تھے۔ بار بار اٹھ کر کبھی ہمارے پاس آتے کبھی کسی اور مسافر کے پاس اور کہتے کہ میں آپ کو اپنے برابر کی سیٹ دلوانا چاہتا ہوں۔ آخر جب ایک صاحب اس پر آمادہ ہوگئے کہ وہ اپنی نشست بدل لیں تو ان کو قرار آیا۔ میں اس قدر شرمندہ ہوا کہ میری خاطر ان کو زحمت ہوئی۔ مگر ان کی خوشی قابل دید تھی جیسے بہت بڑا مرحلہ طے ہوگیا۔

کسی کی شخصیت کا اندازہ انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتا ہے۔ کتنی عظیم شخصیت تھی پروفیسر وقار عظیم کی۔ وقار عظیم سراپا اسم با مسمیٰ تھے۔ شاید ہی کسی نام کے ساتھ یہ جملہ اوصاف ایک جگہ مجتمع ہوئے ہوں۔

انتقال سے چند روز پیشتر دو ملاقاتیں رہیں۔ ایک بار گھر پر دوسری بار ہسپتال میں یوم اقبال کی مصروفیت کے سبب مجھ کو مزاج پرسی کا زیادہ موقع نہ مل سکا۔ تقریب سے دو روز پہلے اکادمی تشریف لائے۔ انتظامات کے مکمل ہونے پر اطمینان کا سانس لیا اور کہنے لگے میں کل ملتان جا رہا ہوں' انشاءاللہ پرسوں ملاقات ہوگی۔ یوم اقبال کی تقریب پر تشریف نہ لائے تو تشویش ہوئی۔ گھر پر جا کر مزاج پرسی کی تو مضمحل پایا۔ تاہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اور کہنے لگے کہ کل عکس ریز (X-rays) کیلئے جانا ہے۔ اصرار کر کے کھانے کیلئے روک لیا۔ دوسرے روز صوبائی اسمبلی میں دفتر گئے۔ دفتری زبان اردو کے لئے اصطلاحات سازی کا کام ہو رہا تھا۔ جس کا ایک ممبر میں بھی تھا۔ تیسرے دن فون کیا تو پتہ چلا کہ ہسپتال میں ہیں۔ شام کو عیادت کے لئے گیا۔ گلوکوز چڑھایا جا رہا تھا' اسی سنجیدہ مسکراہٹ اور گرمجوشی سے پیش آئے۔ کہنے لگے کہ یرقان ہو گیا ہے ٹھیک ہو جاؤں گا۔ جب چلنے لگا تو پوچھا آج کل دستخط کیلئے چیک یا فائل نہیں بھیجتے۔ میں نے کہا آپ کی صحت ٹھیک ہو جائے تو ضرور بھیجوں گا۔ بولے نہیں کاغذات بھیج دیں۔ میں تو امتحان کی کاپیاں اور اقبال پر کتابیں یہیں منگوا رہا ہوں۔ میں ان کی ہمت اور کام کی ذمہ داری کا قائل تو تھا ہی اور بھی متاثر ہوا۔ اللہ رے فرض شناسی! بیمار ہو کر بھی آج کے کام کو وہ کل پر نہ ٹالتے۔ کار دنیا کسے تمام نہ کرد' مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنا بیشتر کام نپٹا گئے۔ یہ دوسروں کیلئے درس ہے کہ دیکھو کام اس طرح کرتے ہیں۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں نے مایوسی کا اظہار کیا ہے اور خون کی ضرورت ہے۔ ہم (میں اور میری بیگم) ہسپتال پہنچے۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔ چھوٹے بڑے قطار میں کھڑے اور ہر شخص کی خواہش تھی کہ پہلے اس کا خون لیا جائے۔ آخر ڈاکٹر کو ان لوگوں کے پتے اور ٹیلیفون نمبر لیکر معذرت کرنا پڑی کہ جب ضرورت ہوگی تو بلا لیا جائے گا۔ یہ تھی پروفیسر وقار عظیم کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی۔ ایک انسان کی اصلی کمائی' لوگ انہیں اپنا خون دیکر زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ انسانیت اور شرافت کے اعلیٰ اقدار کے نمونے کو زندگی بخشنا چاہتے تھے۔ مگر وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ ہم میں نہیں' بے شمار علمی ادبی اور ثقافتی ادارے ان کی سرپرستی سے محروم ہو گئے۔ ٹی وی ان کے پُروقار چہرے سے محروم' ریڈیو ان کی آواز کی گونج کا منتظر مگر وہ خلوص' علم اور انسانیت کا جو چراغ روشن کر گئے ہیں وہ جلتا رہے گا۔ ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

افسانہ

نعیم فاطمہ علوی

روشن ستارا

جب سورج غروب ہونے لگتا ہے۔ اداس اور ویران شام کے عمیق سائے گہرے ہونے لگتے ہیں۔ تو گھپ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا۔ ہر طرح کا انتظار ختم ہو جاتا ہے۔ تب دعائیں بھی لبوں پر آ کر دم توڑنے لگتی ہیں۔

ایسی ہی ایک تاریک رات میں بیٹھا وہ اپنی زندگی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ آج پورا ڈیڑھ سال بیت چلا تھا۔ وہ اپنی ڈگریوں کا بوجھ اٹھائے کہاں کہاں نہ گیا تھا کس کس دفتر کے چکر نہ لگائے تھے۔ مگر مایوسی ہر جگہ اس کا مقدر بن کر اس کا استقبال کرتی رہی۔۔۔ ایسی زندگی میں کیا رکھا ہے۔ اس نے کرب سے پہلو بدل کر سوچا۔ اس سے تو مر جانا ہی بہتر ہے' اے موت تو کہاں مر گئی ہے۔۔۔ میں تیری آغوش میں آنے کیلئے بیتاب ہوں۔ للّٰہ مجھے یہاں سے لے جا۔۔۔ یہ مایوسیاں۔۔۔ محرومیاں۔۔۔ یہ ظالم سوچیں مجھے گیلی لکڑی کی طرح سلگا رہی ہیں' یا خدا میں کیا کروں۔۔۔ کیا کروں خدایا!

جب کبھی میری جائز اور بہت عزیز خواہشات اقتصادی بدحالی کے سامنے سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہیں تو میں انتشار کا شکار ہو جاتا ہوں۔ اُس وقت مجھے زندگی کی ساری سچائیاں' کڑواز ہر لگتی ہیں۔۔۔ خدایا تجھے بھلا ایسی مجبور' مقہور' حاسد' لالچی' محتاج' مغرور' غریب' مسکین' ننگی' بھوکی دنیا بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ تو کیوں خواہشات ابھارتا ہے۔ ضرورتیں پیدا کرتا ہے۔ پھر ان کا کیوں خون کر دیتا ہے۔۔۔ آخر کیوں' یہ قتل و غارت تجھے کیوں پسند ہے!

جذبات۔۔۔ امنگیں' آرزوئیں' تمنائیں' خوشیاں' غم' امیدیں' انتظار' ہاں میرا دل ان سب کا قبرستان بن چکا ہے۔۔۔ مگر اس کے باوجود میں زندہ ہوں' کیا سانس کی آمد و رفت کو زندگی کہتے ہیں۔۔۔ اگر زندگی صرف اسی کو کہتے ہیں تو میں یہ ڈوری ہمیشہ ہمیشہ کیلئے توڑ دوں گا' جو انسان اپنے جسم کا بوجھ نہ اٹھا سکے اسے اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔

میرے اس جوان لاشے کی اس دنیا کو کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ہوتی تو مجھے یوں' دردر کی ٹھوکریں نہ ملتیں۔ آج اس کا دل' دماغ اور اس کا انگ انگ اس کے خیالات کی تائید کر رہا تھا' لیکن۔۔۔ لیکن ایک طاقت ایسی بھی تھی جوان سب خیالات کو رد کر رہی تھی۔ وہ شاید اس کے اندر کی کوئی انجانی سی طاقت تھی۔ اندر کا چھپا ہوا دوسرا انسان۔۔۔ مگر وہ اس طاقت اس اندر کے انسان کی آواز مسلسل دبا رہا تھا' کچل رہا تھا' مسل رہا تھا۔

جب دن کی روشنی دھیرے دھیرے اس کے قریب آئی' تو وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ رات بھر وہ جاگتا رہا ہے یا سویا رہا ہے' اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ وہ ناشتہ سے پہلے ہی اہل خانہ کی چبھتی ہوئی تیز نظروں سے بچنے کیلئے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ ایک ایسا راہرو جس کی کوئی منزل نہ تھی۔ کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ کوئی آشیانہ نہ تھا۔ وہ بے مقصد گلیوں میں گھومتا رہا۔۔۔ گھومتا رہا' صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام وہ اپنے دل کو ہلکا کرنے کیلئے۔۔۔ ذہنی آسودگی کیلئے گھر سے نکلا تھا۔ لیکن اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ گلیاں' یہ در و دیوار' راہ چلتے ہوئے لوگ' یہ اونچی اونچی عمارتیں' سب اس کا مذاق اڑا رہی ہیں۔ اور چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں۔

"ایک پڑھا لکھا آوارہ"

تب وہ اپنی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو لئے کچھ دیر کیلئے ایک درخت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے رکا۔ اس کی نگاہ ایک ضعیف العمر شخص پر پڑی' جو کیلے بیچ رہا تھا۔۔۔ اس کا بوڑھا وجود لرز رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگی ہوئی تھی۔ اس نے بوڑھے کو غور سے دیکھا' اس کے ذہن کی گرد چھٹنے لگی۔ وہ بوڑھا شخص زندگی کا مقابلہ کس جوانمردی سے کر رہا تھا اس کے اندر کے انسان نے اسے جھنجھوڑا۔

اور پھر جب سورج غروب ہونے لگا' اداس اور ویران شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔ ہر طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔ تو اسے ایک روشن ستارا نظر آیا۔ اور وہ اس کی روشنی میں منزل کی طرف چل پڑا اس کے راستے کی ساری گرد چھٹ چکی تھی۔

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

حمد

نقش ترا فزوں فزوں، نام ترا رواں رواں
مدح تری سخن سخن، وصف ترا بیاں بیاں

جلوہ ترا نظر نظر، یاد تری نفس نفس
بات تری دہن دہن، ذکر ترا زباں زباں

ابر ترے فلک فلک، پھول ترے زمیں زمیں
چاند ترے فضا فضا، نور ترا زماں زماں

رُوپ ترا افق افق، رنگ ترا شفق شفق
آب تری گہر گہر، موج تری کراں کراں

تیری دمک کرن کرن، تیری صبا چمن چمن
تیری مہک سَمن سمن، تیرا کرم جہاں جہاں

تیری صدائیں ساز ساز، تیری نوائیں راگ راگ
تیری طلب دعا دعا، تیری پکار اذاں اذاں

میں نے تو رات رات بھر ذکر کیا ہے اشک اشک
میں نے تجھے سحر سحر یاد کیا فغاں فغاں

کام مرا خطا خطا، شان تری عطا عطا
میرے خدا کرم کرم، میرے کریم اماں اماں

سلطان صبر وانی

حمد

خدا کی حمد کروں، بخت سازگار کروں
طوافِ کعبہ یہ جی میں ہے بار بار کروں

مدام پڑھتا رہوں میں تمام اسمِ صفات
میں دل کو نت نئے رنگوں سے ہمکنار کروں

چمن چمن میں پڑھوں تیرے نام کی تسبیح
خزاں کے دور کو آسودۂ بہار کروں

تیری عنایتِ بے پایاں ہی رہی ہر دم
مرا یہ ظرف کہاں ہے اُسے شمار کروں

گرفتِ ساعتِ برہم میں ہوں رہائی دے
میں کب تلک مرے اللہ انتظار کروں

چلوں مدینے کی جانب مثالِ پروانہ
درود پڑھتا رہوں اور جاں نثار کروں

ہر ایک رات سکوں بخش نیند کی خاطر
میں صِرف سورۂ و الناس کا حصار کروں

ہر ایک سمت سے آمین کی صدا آئے
دُعا بلند کروں چشم اشکبار کروں

عبدالعزیز خالد

مدحتِ خیرالانامؐ

دامانِ جنت ذھب سے پھوٹی ہے کیا ضیا!
نورِ خدا سے روئے زمیں جگمگا اٹھا

بارِ عبودیت سے زمیں بوس جس کا سر
شانے پہ جس کے نقش نبوت کھدا ہُوا

سوتا ہے وہ کہاں: ھُوَ یَقْظَانُ ضَاجِعٌ!
رہتا ہے متصل غمِ اُمت میں مبتلا

سچ ہر ایک شے سے ہے جس کو عزیز تر
قائل نہیں جو مصلحت آمیز کذب کا

جس نے دیا اندھیرے کو پیغامِ روشنی
مستِ خودی کو جس نے خدا آشنا کیا

ہر غیرِ ذات فخر و فضیلت کی نفی سے
معیار جس نے عز و شرف کا بدل دیا

اس پر نگاہ پڑتے ہی محسوس ہو معاً
ذوقِ جمال نور کے سانچے میں ہے ڈھلا

حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ وَحَیَّ عَلَی الْفَلَاح
اس کا پیام کیا ہے: یہی درسِ اتقا!

قرآن کی کسوٹی پہ پرکھو حدیث کو
قرآن ہے نصابِ دبستانِ مصطفیٰ

کُلّیتِ حیات کو خانوں میں بانٹ کر
سنت کو اس کی ہم نے فراموش کر دیا

اسلام جو کہ مذہبِ ذوقِ سلیم ہے
ہم نے غلط روی سے اسے کیا بنا دیا!

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

نعت

آخری نبوت کے ایک ایک لمحے میں
بے شمار ازل ملفوف، ان گنت ابد پنہاں

اے مرادِ بزمِ کُن! تیرے بابِ عالی پہ
دست بستہ حاضر ہیں، کیا حدوث، کیا امکاں

طوفِ گنبدِ خضرا ان کا مقصدِ تخلیق
کتنے گنبدِ گردوں صبح و شام ہیں گرداں

اس مکان سے آگے لامکان جتنے ہیں
ہر جگہ چمکتا ہے تیرا چہرۂ تاباں

اس زمان سے آگے لازمان جتنے ہیں
سب گردوں کی صورت ہیں تیرے وقت میں غلطاں

کتنے چاند اور سورج خاک پر بکھر جائیں
تیری ناز فرمائی جھاڑ دے اگر داماں

بے کراں فضاؤں میں کہکشائیں لاکھوں ہیں
سب خراج ہیں تیرا اے شہنشہِ دوراں

عالمین جتنے ہیں تو ہے سب کا پیغمبر
ہر جگہ تری مسند، ہر طرف ترا فرماں

تیری شرع ہے نافذ سب قرونِ ماضی پر
تیری تابع منشور آنے والی سب صدیاں

سید رفیق عزیزی

نعت

اللہ رے الطافِ شہنشاہِ مدینہ
ہر حال میں خوش رہنے کا بخشا ہے قرینہ

صحرائے دل و جاں ہے طلبگارِ بہاراں
سرکارؐ نے یثرب کو بنایا ہے مدینہ

کیفیتِ احوال کی تفسیر ہے والشمس
والیل میں پوشیدہ ہے رحمت کا خزینہ

آقائے ہر عالمؐ ہیں کہ قرآنِ مجسم
چشم و لب و گیسو ہیں کہ آیاتِ مبینہ

کونین میں ہیں یوں کہ ہو جاں جسم میں جیسے
نبیوں میں ہیں یوں جیسے انگوٹھی میں نگینہ

یا مجھ کو مدینہ میں بلا لیجیے سرکارؐ
یا مجھ کو بنا لیجیے خود اپنا مدینہ

مجھ ایسا گنہگار بھلا کس کو پکارے
اے سرورِ کونینؐ بھنور میں ہے سفینہ

اے رحمتِ عالمؐ وہ نظر مجھ کو عطا ہو
ہر سمت نظر آئے مدینہ ہی مدینہ

محمد حسن زیدی

نعت

رب سے مِلی ہے اُن کو قیادت کی روشنی
پھیلی ہے دو جہاں میں رسالت کی روشنی

بھوکے تھے خود حضورؐ مگر میزبان تھے
دیکھی ہے ایسی کس نے سخاوت کی روشنی

بخشش کی ہے طلب تو چلو اُنؐ کی راہ پر
اُنؐ کے ہر اِک عمل میں ہے دعوت کی روشنی

کر دیں گے راہِ خُلد پہ فوراً رواں دواں
ہم عاصیوں کو دے کے شفاعت کی روشنی

وہ بت پرست قوم خدا آشنا ہوئی
جب ان کو دی نبیؐ نے عبادت کی روشنی

سرکارؐ ماہتاب ہیں اصحابؓ ہیں نجوم
پھیلی ہے جن کے دَم سے اِرادت کی روشنی

تاریکئ جہاں میں نہ بھٹکے گا وہ کبھی
حاصل ہے جس کو آپؐ کی صحبت کی روشنی

اللہ کی طرف سے ملی ہے بطورِ خاص
صدیق کو عمر کو رفاقت کی روشنی

انسان کذب و جہل و ہوس میں تھا مبتلا
سرکار نے عطا کی صداقت کی روشنی

بدر و اُحد ہماری شجاعت کے ہیں نشاں
مِلتی ہے ان سے ہم کو جسارت کی روشنی

ہر لمحہ زندگی کا حسیں کیوں نہ ہو حسنؔ
ذکرِ نبیؐ سے مِلتی ہے راحت کی روشنی

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

☆

اک غبارِ پریشاں کی مانند میں ہاتھ ملتا پسِ کارواں رہ گیا
میں نے اتنا مسلسل سفر طے کیا، شوقِ منزل بتا میں کہاں رہ گیا

میں محبت کا پیغام لے کر بڑھا، ایک خنجر نے میری زباں کاٹ دی
وہ جو حرفِ محبت میرے پاس تھا، وہ لب و نطق کے درمیاں رہ گیا

حرمتِ دیں ہو یا احترامِ بشر، جو بھی آئینہ ان کی رسائی میں ہو
سنگِ بیداد سے ریزہ ریزہ کریں، اب یہی کارِ شیشہ گراں رہ گیا

یہ زمیں جو گلابوں سے معمور تھی، یہ تو اب خوں فشاں ہے، شرر بار ہے
اے جنونِ بشر اب ارادہ ہے کیا، وہ ستاروں بھرا آسماں رہ گیا

آندھیو! اب تو خوئے ستم چھوڑ دو، رہ گئے اب تو شاخوں پہ دو چار گُل
بجلیو! اب تو گلشن پہ چشم کرم، کوئی کوئی تو اب آشیاں رہ گیا

کیوں فضا اس قدر گرد آلود ہے، روشنی کی بھی اب راہ مسدود ہے
کیا ہماری صدی عہدِ بارود ہے، کیا بس اب دیکھنے کو دھواں رہ گیا

قتل فرما کے اپنے کسی بھائی کو، آپ نے خیر سے ہاتھ بھی دھو لئے
آستینِ وطن پر تو خوں جم گیا، دامنِ وقت پر تو نشاں رہ گیا

اک لگاتار شب خوں کی زد میں ہیں ہم، پھر بھی خوابِ مسلسل کی حد میں ہیں ہم
جو چلا تھا دیارِ سحر کی طرف، راستے میں وہ سورج کہاں رہ گیا

عبدالعزیز خالد

☆

لگا ہے ظلمتِ یلدا کا پہرہ آٹھ پہر
یہ کیسے دن ہیں کہ جن کی نہ شام ہے نہ سحر
کوئی سنک، کوئی سودا، کوئی خلش، کوئی خواب
کہ جس کا لے کے سہارا کریں یہ عہد بسر
ہیں ہیر پھیر زمانے کے ناگہاں کتنے
کہ دم زدن میں بساطِ جہاں ہو زیر و زبر
ہے بزمِ دہر ہی شاید حساب گاہِ نشور
کہ جس کا ہر گزراں پل ہے ساعتِ محشر
خیالِ خام ہے اُمیدِ ساز و برگِ فلاح
جو بے وسیلہ ہیں یونہی رہیں گے خاک بسر
میانِ خلق و خدا واسطہ نہیں کوئی
نہ کوئی صاحبِ مرقد، نہ کوئی زندہ بشر
شروع دن سے ہیں مہوش نہیں یہ آج کی بات
کٹھور، ہرجائی، ہزلاج، خودغرض، خودسر
ستیں سروش کی آواز بے میانجی حرف
ہم اہلِ راز کی ہر بات ہے عیان و خبر
نجانے ہوتے ہیں شعر و سخن رسا کیسے؟
نجانے آتا ہے گفت و بیاں میں کیسے اثر؟
چلے نہ اپنے علاوہ کسی پہ زور مرا
سفر ہے جو بھی مرا ہے اکیلے پن کا سفر
ہیں خالد ان گنت اسباب نارسائی کے
نہ طے ہوں مرحلے تن کے، نہ دل کے معرکے سر!

سلطان صبروانی

☆

پھیلا ہُوا اک دھوپ کا صحرا مری دنیا
اے دوست نہ خنکی ہے نہ سایا مری دنیا
پھیلی ہوئی ہر سمت ترے پیار کی خوشبو
بہکا ہوا اک ابر کا ٹکڑا مری دنیا
چڑھتے ہوئے سورج کی یہ دنیا ہے پُجاری
ڈھلتے ہوئے سورج کا تماشا مری دنیا
ذروں سے سمٹ جانے کی اُمید عبث ہے
بکھرے ہوئے ذروں کا تماشا مری دنیا
ان ہجر کی راتوں کا فقط ایک تصور
نکھرا ہوا اک نور سا چہرا مری دنیا
بھیگی ہوئی زلفوں کی مہک پھیلی ہے ہر سو
زلفوں میں چھپا چاند سا چہرا مری دنیا
اک لفظ تری پیاس بجھانے کے لئے ہے
اک پل کو مرے پاس بھی رُکنا مری دنیا
صدیوں سے مقید اِسی لمحے کے لئے ہوں
جو لمحہ کہ پل بھر بھی نہ ٹھہرا میری دنیا
دنیا کی تمنا تو ہے موہوم سی خواہش
ہے خالقِ دنیا کی تمنا مری دنیا
نابینا زمانے کو بھلا کیسے دکھاؤں
الفاظ کی دُنیا کا تماشا مری دنیا
اے صبر مجھے پار اُترنا ہے سلامت
ہر چند کہ ہے آگ کا دریا مری دُنیا

پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہوی

☆

سال رفتہ کی حکایت ابتلا سے کم نہ تھی
زندگانی نسلِ آدم پر بلا سے کم نہ تھی

خون کے دریا کی لہروں میں بشر غرقاب تھا
وقت کی رفتار گویا بددعا سے کم نہ تھی

پھر رہے تھے حکمراں کشکول لیکر دربدر
بندگی کی ظاہری صورت گدا سے کم نہ تھی

ہر طرف خونیں بھنور، ہر سمت چیخوں کے عذاب
موجِ گل بھی اب کے دوزخ کی ہوا سے کم نہ تھی

معبدوں میں جن کے ایماء پر لہو چھڑکا گیا
ان کے خال و خط کی رونق پارسا سے کم نہ تھی

ظلم کے عفریت نے شہروں کو ویراں کر دیا
یوں تو بربادی جہاں میں ابتدا سے کم نہ تھی

جانے کس گرداب ظلمت میں کہ بویا ہے انہیں
جن کی روشن رہنمائی ناخدا سے کم نہ تھی

☆

مسابقت کے لئے عہد ساز کام کریں
نتیجہ خیز وسائل کا اہتمام کریں

سحر کی کہر سے پہلی کرن نے جھانکا ہے
شعاعِ مہر کا بھرپور احترام کریں

خلوص و مہر و وفا کی کرن بھی پھوٹے گی
منافرت کو اگر دل سے زیرِ دام کریں

نظامِ شمس میں گاڑیں شعور کے خیمے
خلا میں جا کے نئے رنگ سے خرام کریں

قدیم فکر کے مکروہ توشہ خانوں کا
مکالمات کے تیشے سے انہدام کریں

فراز زہرہ و مریخ پر قدم رکھیں
خرد گری کی فضا میں بھی کچھ قیام کریں

جمالِ فطرتِ صد رنگ کے تقاضوں کو
نئی تلاش کی حدبندیوں سے رام کریں

زمین بانٹ دیں بے آسرا کسانوں میں
ادارہ جات کی اسناد ان کے نام کریں

جو بے قصور لہو میں نہا گئے ہیں خیال
ادب سے ہاتھ اٹھا کر انہیں سلام کریں

سید مشکور حسین یادؔ

☆

نظر اُٹھانا بلندیٔ جاں کی پیائش
نظر جھکانا زمین و زماں کی پیائش

تمام دہر کو لے آنا ایک نقطہ پر
کسی کو چاہنا سارے جہاں کی پیائش

ہمیشہ رہنا کسی کے خیال میں سرشار
یقیں کے ساتھ یہ وہم و گماں کی پیائش

بکھر نہ جائے کہ اس کو اٹھانا مشکل ہے
وجودِ گُل سے ہے سنگِ گراں کی پیائش

ہماری خاک اڑائی گئی تو کیا اے دوست
ہمارے ساتھ ہوئی آسماں کی پیائش

پڑے یہ جس پہ بھی اس کی سنوار دے قسمت
عجیب ہے نگہِ ناگہاں کی پیائش

لبوں پہ یادؔ بہارِ سخن دکھاتی ہے
یہ شاخِ خامشی، برگِ بیاں کی پیائش

☆

حق سے ہم آغوش ہے باطلِ ناخواستہ
گویا کہ قسمت میں ہے حاصلِ ناخواستہ

شاخِ تر و تازہ دل میں بٹھاؤ اسے
غم کا پرندہ کہ ہے نازلِ ناخواستہ

کیوں نہ دکھائیں اسے صورتِ سہلِ سرشت
سارا زمانہ کہ ہے مشکلِ ناخواستہ

آؤ اُتر کر یہیں شہرِ شکایت بسائیں
آ جو گئی سامنے منزلِ ناخواستہ

خواہشوں کی صورتیں کیسے ہوں من مورتیں
ہم جو بناتے ہیں خواب باگلِ ناخواستہ

پھر تو کئی چہروں نے پیار سے دیکھا ہمیں
شمع نے روشن جو کی محفلِ ناخواستہ

ہم نے تو جو کچھ کیا یادؔ کیا شوق سے
آیا نہ جینا ہمیں بادلِ ناخواستہ

صادق نسیم

☆

عظمتِ فکر کے انداز عیاں بھی ہونگے
ہم زمانے مین سبک ہیں تو گراں بھی ہونگے

جن ستاروں کو خدا مان کے پوجا تھا کبھی
اب انہی پر مرے قدموں کے نشاں بھی ہونگے

سرفرازی کی ادا آتی ہے آتے آتے
آج سایہ ہیں تو کل سروِ رواں بھی ہونگے

آنکھ کے آئینے اللہ سلامت رکھے
زخم سینے کے نہاں ہیں تو عیاں بھی ہونگے

ظلم کی آخری لو تیز ہے پر اہلِ جفا
تخت پر ہیں تو سرِ نوک سناں بھی ہونگے

کیسے رہ سکتی ہیں جنت کی فضائیں شفاف
خاک اڑانے کو ہمی لوگ وہاں بھی ہونگے

نوید سروش

☆

اک لفظ میرے دل پہ وہ تحریر کر گیا
مجھ کو سراپا صورتِ تصویر کر گیا

گزرا میرے قریب سے اک شخص اس طرح
میری شبِ حیات کو تنویر کر گیا

گوشہ نشینی اب کسی نعمت سے کم نہیں
فکرِ رسا کو وہ مری زنجیر کر گیا

سب سے عزیز دوست سمجھتا تھا میں جسے
کل شب مرے خلاف وہ تقریر کر گیا

وہ کون تھا جو تاج محل اپنے پیار کا
میرے دل و دماغ میں تعمیر کر گیا

جس وقت فیصلے کی گھڑی آئی تو سروش
آیا نہیں وہ آنے میں تاخیر کر گیا

اختر علی خاں اختر چھتاروی

☆

صحرائے جاں میں ناقہ و محمل نہیں کوئی !
ھو کا سماں ہے ، منظرِ منزل نہیں کوئی !

پھرتے ہیں سر جھکائے ہوئے ہم سے جاں بکف
واحسرتا ، کہ قتل پہ مائل نہیں کوئی !

سننے کو کان ، "أعظم شانی" ترس گئے
مدت سے آئینے کے مقابل نہیں کوئی !

آتی نہیں کہیں سے "انا الحق" کی بازگشت
اہلِ جنوں میں دار کے قابل نہیں کوئی !

کب سے نہیں سنا ہے زمانے نے "لا تخف"
یزداں خصال و غوث شمائل نہیں کوئی !

دیکھیں کسے جو یاد ستائے رسول ﷺ کی
کیا ، اُسوۂ رسول ﷺ کا حامل نہیں کوئی ؟

اے "اَولیائی تحت قبائی" کے رازداں
گلزارِ جاں میں شورِ عنادل نہیں کوئی

اہلِ وفا کے واسطے اختر ، عجب ! عجب ! !
اس شہرِ بے مہار میں محمل نہیں کوئی

سرور انبالوی

☆

کب امیدیں بر آئی ہیں، کب پورا ارمان ہوا
کس خاطر یہ دل ہے پریشاں، کیوں اتنا نادان ہوا

چپ ہی بھلی ہے ہم سے یارو، اس دل کی کیا پوچھو ہو
رسم وفا سے جو ناواقف اس پر ہی قربان ہوا

فطرت کا شہکار ہے لیکن کیا کیا اس پر بیتی ہے
کتنے قرنوں سے گزرا ہے تب جا کر انسان ہوا

آئینہ گر نے اپنے ہاتھوں آئینہ خود تخلیق کیا
اس اندر پھر دیکھ کے اپنی صورت خود حیران ہوا

دھونی رمائے بیٹھا ہے کیوں سنگدلوں کی بستی میں
اس نگری میں کون ہے اپنا کیوں اتنا نادان ہوا

ترک سکونت کر کے ہم تو صحرا میں آ بیٹھے ہیں
"سر نہ اٹھا کر کوئی چلے" جب شہر میں یہ اعلان ہوا

خانہ بدوشوں کی صورت ہم نگری نگری گھومے ہیں
خونِ جگر سے اس کو لکھا تب اپنا دیوان ہوا

روند کے اپنے پاؤں میں یارو، وقت گزرتا جاتا ہے
کب یہ سرور انبالوی دیکھے کس کا کیا نقصان ہوا

جعفر بلوچ

☆

کب سے ہیں منتظر تری رحمت کے یا خدا
وہ جن کے درد کا ہے وظیفہ خدا خدا

نامختتم سفر سے دلوں میں ہیں وسوسے
قزاق ہی نہ ہوں جو بظاہر ہیں ناخدا

دانا جو تھے وہ خود سے خدا تک پہنچ گئے
ہم ابلہوں سے دیکھیے کرتا ہے کیا خدا

اے شیخ معبدوں میں نہیں میکدوں میں ڈھونڈ
ارزاں نہیں ہے صحبتِ مردانِ باخدا

اک جذب خاص تھا جو بچا لے گیا مجھے
سجدہ طلب تھے ورنہ یہاں جا بہ جا خدا

اصرار کیوں درازیٔ دست دعا پہ ہے
کیا میرے دل کا حال نہیں جانتا خدا

جعفر یہ خوف ہے کوئی بت پوچھ ہی نہ لے
کیوں خیر تو ہے؟ کس لیے یاد آ گیا خدا؟

☆

کوئی کہہ دے تربت تربت دیپ جلانے والوں سے
جیتے جی محروم ہیں اب تک کچھ انسان اجالوں سے

وحشت خیز خیالوں میں کیوں گم رہتے ہو، یاد رہے
اجڑے خواب دکھائی دیں گے ان ویران خیالوں سے

زہد و روع کے ماتوں کو بھی ہم نے بہکتے دیکھا ہے
نشہ کچھ مخصوص نہیں ہے شیشوں اور پیالوں سے

آک نہائے دھوئے بارش میں تو کیسی خوش فہمی
کیا اسکی کڑواہٹ ڈھل جائے گی مینہ کے جھالوں سے

زخم رسیدہ ہی ملتا ہے آج ہلال جہاں بھی ہے
عصرِ رواں یہ زخم ملے ہیں تیرے خیر سگالوں سے

آپ کی عشرت سامانی پر حرف نہ کوئی آ جائے
آپ نہ پوچھیں وجہ تباہی ہم آشفتہ حالوں سے

جعفر ہم توحید اور ختم نبوت کا دم بھرتے ہیں
نقشِ حیات اپنا روشن ہے ان پُر نور حوالوں سے

سید رفیق عزیزی

☆

دل ، عقل سے آمادۂ پیکار ہوا ہے
شاید کہیں پھر تذکرۂ دار ہوا ہے

اے فصلِ بہاراں ، یہ پذیرائی جنوں کی
ہر کوچہ ء گل ، وادیِ پُرخار ہوا ہے

دیوانے ترے شہر میں جس روز سے آئے
ہر شب کو طلوعِ رسن ودارر ہوا ہے

کہتی ہیں صلیبیں کوئی منصور نہ ہونا
دل اس پہ بھی تیرا ہی خریدار ہوا ہے

ہیں انفس و آفاق حدیثِ لب و رخسار
کیا کیا نہ ترے حُسن کا اظہار ہوا ہے

سروشہ خان

☆

حال گلشن پر عیاں ہے چشم تر اب کے برس
آشیاں کتنے جلیں گے کیا خبر اب کے برس

ہوگئی نامعتبر منزل شعور و فکر کی
ایک ٹھوکر ہوگئی ہے راہ بر اب کے برس

رہ نما جو تھے کبھی، یادوں کے سارے قافلے
ہوگیا ویران یہ دل کا نگر اب کے برس

جانے کیسا بے زباں سا خوف رہتا ہے مجھے
کوئی جانے ، ہو کسی کو تو خبر اب کے برس

کتنی لمبی رات ہے تھمتی نہیں رکتی نہیں
صبح ہوائے کاش مل جائے سحر اب کے برس

محمود رحیم

☆

چراغ آخر شب بھی، ہوا سے لڑنا بھی
نظر میں رکھنا ملاقات بھی، بچھڑنا بھی

کسی کو کھونے کا امکاں بھی ذہن میں رکھنا
ہے وصل رت کے تعاقب میں ہجر پڑنا بھی

حیات جمع تضادات سے عبارت ہے
کہ ہنستے بستے بھی رہنا مگر اجڑنا بھی

وقوع پاتے رہے ہیں عجیب امکانات
گرفتِ رنگ بھی اور تتلیاں پکڑنا بھی

کچھ اس طرح سے ہے شاید حیات کی تمثیل
کہ سیدھی راہ بھی اور دائروں کا پڑنا بھی

یہ شعر کہنا کچھ آسان تو نہیں صاحب
سفال ریزے بھی چننا، نگین جڑنا بھی

رحیم کیسا انوکھا زمانہ بچپن کا
شتاب مان بھی جانا، ضدوں پہ اڑنا بھی

سیف الرحمٰن سیفی

☆

یہ ہست و بود عدم اور امکاں کیا ہے
یہاں نہیں ہے اگر کچھ تو پھر وہاں کیا ہے

ہے تیری جلوہ نمائی جہان کا مفہوم
جو تو نہ جلوہ نما ہو تو پھر جہاں کیا ہے

تلاشِ حق میں ہوں گم، کچھ خبر نہیں مجھ کو
یقین کیا ہے یہاں اور یہاں گماں کیا ہے

تلاشِ حسن ہی جو زندگی ہے میرے لیے
تو کارِ عشق میں پھر جان کا زیاں کیا ہے

قفس میں جس نے گزاری ہو زندگی ساری
پھر اس کے واسطے گھر کیا ہے آشیاں کیا ہے

مری نظر ہی سے قائم ہیں کائنات کے رنگ
نہ ہوں جو میں تو زمیں کیا ہے آسماں کیا ہے

ہے جس کے ہاتھ میں سیفی نظامِ کون و مکاں
وہ جانتا ہے کہاں کون اور کہاں کیا ہے

گفتار خیالی

☆

مجھ سے تو کرب ذات کی زیبائی چھین لی
میرے دکھوں سے تو نے مسیحائی چھین لی

زنجیر عدل ہے اسی در پر لگی ہوئی
جس نے کہ مرے نطق کی برنائی چھین لی

وہ حوصلے ہیں اب نہ وہ طوفاں نہ وہ سکوت
گویا سمندروں سے بھی گہرائی چھین لی

تہذیب عصرِ نو کے دمکتے اصول نے
انسان کی زبان سے سچائی چھین لی

یہ بھی ستم ہوا ہے کہ فصل بہار میں
کھلنے لگے جو پھول تو رعنائی چھین لی

جرعہ پلا کے انجمن آرائی کا مجھے
تو نے تمام عمر کی تنہائی چھین لی

گفتار کس طرح ہو اجالوں پہ اعتماد
جب روشنی نے آنکھ سے بینائی چھین لی

مسلم شمیم

☆

برف کی سی کیفیت کا درد ہے
ان دنوں اندر کا موسم سرد ہے

سوچیے تو فکر کا چشمہ ہے خشک
نخلِ جاں کا پتا پتا زرد ہے

ہر طرف بغداد کا سا ہے سماں
اندروں آباد شہرِ درد ہے

دھند آنکھوں میں، گھٹن سانسوں میں ہے
بوئے گل، رنگِ چمن سب گرد ہے

وقت کے چہرے پہ ہیں کیا کیا سوال
کرب میں ڈوبا ہوا ہر فرد ہے

گردشِ خوں تیز تر کرتا ہے غم
آج کل دکھ ہمدم و ہمدرد ہے

سانحہ کیا پیش آیا ہے، شمیم!
ہے نظر بے سمت، جذبہ سرد ہے

سیف الرحمٰن سیفی

☆

ہمارے دم سے ہے جو کچھ یہاں ہے
وگرنہ دنیا اک خالی مکاں ہے

نظر کہتی ہے میرے پاس ہو تم
مگر پردہ سا کیوں یہ درمیاں ہے

گواہی کیوں کوئی دے گا ہماری
یہاں سچ بولنا کارِ زیاں ہے

صداقت کی حمایت کا نتیجہ
ہمارا سر ہے اور نوکِ سناں ہے

میں سایا جسِ حقیقت کا ہوں سیفیؔ
حقیقت وہ خدا جانے کہاں ہے

محمود رحیم

☆

بے خبر ہوں، کمال کرتا ہوں
تیری باتیں خیال کرتا ہوں

پتھروں کی مثال ہیں آدم
پتھروں سے وصال کرتا ہوں

بخشتی ہے عروج ذات اپنی
اپنے ہاتھوں زوال کرتا ہوں

تیری آنکھوں کی قربتوں کے طفیل
زندگی مالا مال کرتا ہوں

چہرہ خود ہے سوالیہ انداز
میں کہاں، کب سوال کرتا ہوں

نورالزماں احمد اوج

☆

رنگینئ بہار چمن کے بغیر کیا
جذبات نو شراب کہن کے بغیر کیا

سمجھیں گے کیا وہ بات اشارے کنائے سے
دیں گے جواب عرض سخن کے بغیر کیا

انجام آرزو کا ذرا بھی نہیں خیال
لاشے کو دفن کر دیں کفن کے بغیر کیا

لو وہ بھی میرا نام و نشاں پوچھتے ہیں اب
ارض وطن ہے اہل وطن کے بغیر کیا

جوش جنوں کو چاہئیں صحرا کی وسعتیں
رکھتے ہیں وحشی دار و رسن کے بغیر کیا

ناقص سہی پہنچتے ہیں انساں کمال کو
ہوتا ہے چاند پورا گہن کے بغیر کیا

دل میں جگہ نہ دو گے مرے جذب وشوق کو
بھٹکا کرے گی روح بدن کے بغیر کیا

جتنی بھی ہو مرقع جذبات شاعری
اوج سخن مہارت فن کے بغیر کیا

گلنار آفریں

☆

سوچتی ہوں کہ اب کوئی جائے کہاں
ہر طرف آگ ہے ہر طرف ہے دھواں

پتھروں سے مکاں کو سجاتی ہوں میں
میرے کس کام کا کار شیشہ گراں

دن کے لمحے نظر کے لئے مختصر
رات کی ظلمتیں کس قدر بیکراں

موج غم سے سفینہ الجھتا رہا
آنسوؤں کا سمندر رہا درمیاں

جب گری برق تو صرف یہ یاد ہے
ہم پکارا کیے آشیاں آشیاں

اے مرے رہبر و راستوں میں ہی کیا
منزلوں پر بھی لوٹا گیا کارواں

آسماں پر اب اس کی ضرورت نہیں
اب زمیں پر اتر آئے گی کہکشاں

ایسے حالات میں کیسے زندہ رہیں
اب یقیں ہے کوئی اور نہ کوئی گماں

اہل محفل کو گلنار نیند آ گئی
ختم ہونے لگی جب مری داستاں

منصور عاقل

☆

نہ زادِ راہ ' نہ منزل نہ جادہ رکھتے ہیں
سفر ہے شرط ' سفر کا ارادہ رکھتے ہیں

بہار ہی سے نہیں بہرہ مند اہلِ جنوں
خزاں سے بھی شرفِ استفادہ رکھتے ہیں

فقیرِ راہ نشیں ہو کے بھی غنی ہیں بہت
کہ دل کی شکل میں اک شاہزادہ رکھتے ہیں

ہماری بزمِ وفا میں حلیف ہو کہ حریف
کوئی بھی آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

جو شاہِ کبر کو دے شہ بھی اور مات بھی دے
بساطِ عجز پہ ہم وہ پیادہ رکھتے ہیں

ہماری حرماں دلی کا سبب کچھ اور نہیں
یہی کہ اُن سے توقع زیادہ رکھتے ہیں

تمہارے عہدِ ستم میں متاعِ غم کے سوا
بس ایک جاں ہے سو "بر کف نہادہ" رکھتے ہیں

اکرام تبسم

☆

لفظ سے لفظ جوڑتے رہنا
میرا فن خود کو توڑتے رہنا

رس نہ ٹپکا تو زہر ٹپکے گا
خواہشوں کو نچوڑتے رہنا

خون مہکے گا خوشبوؤں کی طرح
سرُ گلابوں سے پھوڑتے رہنا

چلتے رہنا نہ ان کی مرضی سے
رُخ ہواؤں کا موڑتے رہنا

حیرتیں آئینوں میں رہتی ہیں
اپنی آنکھیں نچوڑتے رہنا

کم نظر لوگ جن کو اپنا لیں
اُن رواجوں کو چھوڑتے رہنا

دکھ تبسم ہیں بدمزاج بہت
ان کے بازو مروڑتے رہنا

قمر رُعینی

نعتیہ رباعیات

وہؐ صدقِ اتم انؐ سے صداقت کا بھرم
کونین میں رونق کا سبب انؐ کا دم
ہر خوبیٔ تخلیق ہے انؐ کا صدقہ
عیبوں سے مبرا ہیں رسولِ اکرمؐ

اللہ جنہیں عرش پہ بلواتا ہے
ایک ایک نبی جن کے گُن گاتا ہے
اُس مہر جہاں تاب کا تو ہے مداح!
سورج کو قمر چراغ دکھلاتا ہے!

کیا اور کوئی انؐ کا ہوا ہم پایہ؟
کیا اور کسی نے بھی یہ رتبہ پایا؟
کیا یہ ورفعنا کی تفسیر نہیں
خود فرش پہ ہیں عرش بریں پہ سایہ

گھمبیر ہوا جب بھی غم کا سایہ
جب قلب پریشاں نے مجھے تڑپایا
جب کوئی بھی تسکین کی صورت نہ رہی
بے ساختہ نام آپؐ کا لب پر آیا

انؐ جیسا کوئی فخرِ اب وجد نہ ہوا
انؐ کا کوئی ہم پایہ و ہم قد نہ ہوا
آنے کو تو کتنے ہی پیمبر آئے
لیکن کوئی محمود و محمدؐ نہ ہوا

لب پر نہیں کچھ آپؐ کی مدحت کے سوا
خواہش نہیں کچھ جذبۂ طاعت کے سوا
جنت کی طلب، زر کی ہوس، لذتِ نفس
کچھ دل میں نہیں انؐ کی محبت کے سوا

لاریب کہ پیغام طرب ناک ہیں آپؐ
اللہ کے اے پیارے نبیؐ پاک ہیں آپؐ
انسان سے ممکن ہی نہیں حمد وثنا
سرکار برون حد و ادراک ہیں آپؐ

اے کاش بر آئے یہ تمنائے حسیں
اے کاش سکوں پائے مرا قلب حزیں
رہنے کو مدینے میں جگہ مل جائے
بالائے زمیں ہو یا ہو زیرِ زمیں

رباعیات

عبدالعزیز خالد

(۱)

ماضی کے نقوش ہو رہے ہیں نابود
وہ فرشِ زمیں ہے اب نہ وہ چرخِ کبود
کرتی ہے نئی پود دھڑلے سے سوال
کیا باعثِ برکت ہے بزرگوں کا وجود؟

(۲)

ہو کاش میسّر تجھے عبرت کی نگاہ
دیکھے تُو مآلِ سطوت و مکنت و جاہ
بیجا ہے گھمنڈ قدرت و قوّت کا
لا حولَ وَلا قُوَّۃَ اِلّا باللہ!

(۳)

کس برتے پہ کرتے کوششِ حق طلبی؟
رکھتے کس سے توقّعِ دادرسی؟
کیا حق السّعی سب کو مل جاتا ہے
ہوتی نہیں حقدار کی کیا حق تلفی؟

(۴)

خالدؔ حیوانوں اور انسانوں میں
کیا فہم و تعقّل کے سوا فرق کریں؟
ہونے دے نہ اپنی سوچ کے سوتوں کو خشک
سوچیں ہی ہماری زندہ رکھتی ہیں ہمیں!

(۵)

معناً پہناور اور لفظاً مُجمل
ہیں شعر مرے اگرچہ بے عیب و علل
حاصل نہ ہوا ان کو قبولِ خاطر
ہوتی ہے نجانے سادھنا کن کی سپھل؟

(۶)

کیوں دیکھ کے نقشہ ملّتِ بیضا کا
آتا ہے مجھے یاد سلیمانی عصا
لگتا تھا بظاہر جو صحیح و سالم
اندر سے مگر ریختۂ دیمک خوردہ!

(۷)

جانے ملی کس قصور کی مجھ کو سزا
زندہ ہوں اگر تو بس توکّل بخدا!
کانٹوں سے لہولہان شیلے کی طرح
بھیشم کے سماں سیج مری بان شیا!

(۸)

اک راز ہے سربستہ نظامِ قدرت
ادراک سے باہر ہے خدا کی حکمت
میلہ ہے لپک جھپک کا یہ بزمِ رواں
آتے ہی ملے جہاں پہ حکمِ رخصت!

قطعات

پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہوی

چراغِ فردا

ذرۂ خاک کو خورشید بنا کر دیکھا
ذہن میں حُسن کو ہر شکل سے لاکر دیکھا
کیا نہ کچھ اپنی غلط سوچ سے جھیلے ہیں عذاب
حد ہے پتھر کو بھی انساں نے "خُدا" کر دیکھا

دیکھ پھر ارض وطن تازہ لہو مانگے گی
تشنگی ساغر و مینا و سبو مانگے گی
سجدۂ خاص ادا کرنے جو پڑھنی ہے نماز
پہلے آزادئ مشرب کا وضو مانگے گی

بیتے وقتوں پہ جو سوچا ہے تو آنسو آئے
سوچ یوں آئی کہ جیسے کوئی آہو آئے
عصر حاضر سے فقط میری تمنا یہ ہے
نسل نو سے مرے افکار کی خوشبو آئے

جتنے انسان کے دشمن ملیں بلڈوز کریں
جتنے غاصب نظر آ جائیں زمیں دوز کریں
صرف باتوں سے جراثیم نہیں مر سکتے
ان پہ زہراب کا چھڑکاؤ شب و روز کریں

ابتداء نقطہ آخر کی خبر دیتی ہے
خشک کھیتی بھی لگن ہو تو ثمر دیتی ہے
بے شعوری وہ بلا ہے جو نہیں دیتی نجات
بلکہ تہذیب کو امراض سے بھر دیتی ہے

زخمِ دل مرہم کا فور نہیں بھر سکتا
بخت نادار کا ناسور نہیں بھر سکتا
حرص ہے پیکر آدم کے لہو میں شامل
اس لئے کاسۂ جمہور نہیں بھر سکتا

ایسی تنہائی کہ وحشت بھی مددگار لگے
رنگ و آہنگ کا ہر زاویہ بیکار لگے
ذہن سے قلب جدا' آنکھ سے اعصاب جدا
یہ حقیقت ہے تو کیوں زندگی ہموار لگے

قناعت ہو تو ہر خِطہ وطن کا
عرب ہے' چین ہے' رشک ختن ہے
اگر بیگانگی اعصاب میں ہو
تو جنت بھی جہنم کی بہن ہے

تماشہ گاہ جہاں میں عجیب رنگ آئے
جو سنگ لیکے چلے تھے وہ زیرِ سنگ آئے
جفا کے تخم سے نخلِ وفا نہیں اگتا
وہ انتقام تو لے گا جو تجھ سے تنگ آئے

نظامِ جہل میں طرزِ سخن بھی یاد نہیں
جوان عہد کا وہ بانکپن بھی یاد نہیں
اداس عمر کا نسیان اف معاذ اللہ
کہ اقربا تو الگ ہیں' وطن بھی یاد نہیں

مضطر اکبرآبادی

قطعات

(۱)

گردشِ روزگار رہ رہ کر
یوں الجھتی ہے تیرہ بختوں سے
جیسے اک بدمزاج آندھی کو
ضد ہو ثابت قدم درختوں سے

(۲)

ناگہاں یوں کسی نگاہ کا قہر
ناتواں دل پہ ٹوٹ پڑتا ہے
جیسے اک بے قرار موج کا ناز
عجزِ ساحل پہ ٹوٹ پڑتا ہے

(۳)

حد سے بڑھتی ہے جب بھی مایوسی
سمٹ آتی ہے تیرگی دل میں
پھر کسی کا خیال آتے ہی
پھیل جاتی ہے چاندنی دل میں

(۴)

حوالے نیند کے جو کر گئی تھی آخرِ شب
تھی بالیقیں وہ ترے انتظار کی خوشبو
جو آنکھ کھلتے ہی دیوانہ کر گئی تھی مجھے
تری مہک تھی کہ صبحِ بہار کی خوشبو

(۵)

ہیں زندگی کے خدوخال بھی بہت تیکھے
بجا ہے یہ بھی کہ تم بھی مری ضرورت ہو
کسے قبول کسے مسترد کیا جائے
ہے زندگی بھی حسیں تم بھی خوبصورت ہو

(۶)

غروب ہوتا ہے جب آفتاب مغرب میں
تو شاخِ دل پہ مرادوں کے پھول کھلتے ہیں
قبول ہوتی ہیں مضطرؔ دعائیں لوگوں کی
ہجومِ شوق میں جب دونوں وقت ملتے ہیں

محشر زیدی

تلقینِ صبر

صبر بہتر ہے دلِ وحشت بہ داماں صبر کر
فرطِ غم سے یوں نہ ہو سر در گریباں صبر کر

استقامت وصف غالب ہے ترے کردار کا
تیری جانب تک رہی ہے بزمِ امکاں صبر کر

آ گیا ہے خیر سے کم ظرف کے ہاتھوں میں جام
دیکھیے کب تک رہے توہینِ رنداں صبر کر

تلخ گفتاری کو مانع ہے نظامِ مے کدہ
درگزر ہے شیوۂ بادہ گساراں صبر کر

مرگِ بے ہنگام ہی قسمت ہے ہر ہابیل کی
خوں سے نم ہے دفترِ تاریخِ انساں صبر کر

تو بہ زعمِ خود جسے سمجھا تھا دستِ حق نما
ہاں، وہی نکلا چراغِ زیرِ داماں صبر کر

تیری ہمت کے تصدق عنقریب آ جائے گا
آپ اپنے دام میں ابلیسِ دوراں صبر کر

اب ترا رنجِ اسیری بن چکا ہے کوہ کن
اب گرا دی جائے گی دیوارِ زنداں صبر کر

جہل کی یہ تیرہ سامانی بس اب لمحوں کی ہے
ہم اُجالیں گے محبت کا شبستاں صبر کر

عجلتیں ہیں بے سبب، بے فائدہ ہے اضطراب
دور کب ہے آمدِ صبحِ بہاراں صبر کر

اپنے ہی دل کی عدالت میں لگے گی فردِ جرم
منفعل ہو گی نگاہِ فتنہ ساماں صبر کر

ترک مت کر خیر، کھائے جا محبت کے فریب
وقت لے گا انتقامِ سینہ چاکاں صبر کر

پھر کوئی بلقیس شرمائی ہوئی آ جائے گی
پھر سبا تک جائے گا مرغِ سلیماں صبر کر

اس کی بوئے پیرہن ہے اُس کی آمد کی نوید
آ ملے گا تجھ سے مثلِ ماہِ کنعاں صبر کر

ہجر کے بادل اُڑا لے جائے گی بادِ وصال
حسن در آئے گا رقصان و غزل خواں صبر کر

اب نہیں ہے عشق کو نامحرموں کی احتیاج
خود پکارے گا تجھے آغوشِ جاناں صبر کر

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

قیدی

میں گہرے دریا کا موتی
میں اونچے آکاش کا تارا
میں ان دیکھے پھول کی خوشبو
میں ان جانے دیس کا راہی
مارا مارا پھرتا پھرتا
پہنچا ایک نئی بستی میں
شاید وہ اندھیر نگر تھا
وہاں مجھے اک شخص نے پکڑا
اپنی مرضی کی زنجیریں
میرے ہاتھوں میں پہنا کر
مجھ کو اپنی قید میں ڈالا
میرا تارا، میرا موتی،
میری رنگت، میری خوشبو،
سب کچھ ٹوٹا، سب کچھ بکھرا،
اب میں کیا ہوں، کچھ بھی نہیں ہوں
بس اس کا بے بس قیدی ہوں
وہ زنداں کے دروازے پر
میری نگرانی کرتا ہے
اس ظالم کو، اس کافر کو
عاصی کرنالی کہتے ہیں

آفاق صدیقی

اجڑے گھر کی یاد

جنم لیا تھا جس گھر میں اور جہاں رہے آباد
جیون بھر کا سوگ بنی اس اجڑے گھر کی یاد

اپنی مٹی اور ممتا کے سپنوں کا آدھار
کیسا پاگل پن تھا جس نے چھین لیا وہ پیار

اپنے گھر کے آنگن میں وہ نیم کی ٹھنڈی چھاؤں
کتنی ٹھنڈک پا جاتے تھے دھوپ سے جلتے پاؤں

آگ دھوئیں اور لہو میں لت پت ہو گئے سب ارمان
جگ بیتا پر ٹلا نہ اب تک اٹھا تھا جو طوفان

سوچ رہا ہوں جانے کب سے دیس ہے یا پردیس
کون آتا ہے من درپن میں بدل بدل کے بھیس

کچھ البیلی صورتیاں جب میرے سامنے آتی ہیں☆
دل تو اور کہیں ہوتا ہے اکھیاں دل بن جاتی ہیں

☆ تبدیلیِ بحر! حسنِ ایجاد کہ ایجادِ حسن؟ (ادارہ)

امجد قریشی

پہلی نگاہ

پہلی نگاہ حشر سا ڈھاتی چلی گئی
سرمایہ ء حیات لٹاتی چلی گئی

ارض و سما پہ نور سا چھاتا چلا گیا
کون و مکاں کو طور بناتی چلی گئی

ذوقِ نظر کو آرزوئے دل بنا دیا
دل کی لگن کو اور بڑھاتی چلی گئی

میخانہ ء حیات میں ساغر کھنک اٹھے
ہر دل کو بادہ خوار بناتی چلی گئی

وہ داستانِ عشق جو پنہاں دلوں میں تھی
خاموشیوں میں اس کو سناتی چلی گئی

دے کر رخِ جمال کی ہلکی سی اک جھلک
کانٹوں کو لالہ زار بناتی چلی گئی

المختصر کہ آج وہ امجد نگاہِ ناز
طوفان حسرتوں کا اٹھاتی چلی گئی

مسلم شمیم

بھیگا ہوا جنگل

بہت برسے ہیں بادل اب کے ساون کے مہینے میں
مگر کھیتوں میں من کے اپنے' ہریالی نہیں آئی
جلو میں فصلِ باراں اپنے' سرشاری نہیں لائی
صبا مدت سے پھولوں کی خبر لینے نہیں آئی
نظر میں برگ ہائے زرد کا موسم نہیں بدلا
ہمارے شہرِ جاں میں درد کا موسم نہیں بدلا

☆

گزرتے ہیں کچھ اس انداز سے اب روز و شب اپنے
کوئی سایہ پسِ سایہ چلے آہستہ آہستہ
عدم آباد کی جانب بڑھے آہستہ آہستہ
کوئی بھیگا ہوا جنگل جلے آہستہ آہستہ
زمیں نم ہے' فضا نم ہے مگر جلوے سلگتے ہیں
جھلستی ہے فصیلِ فکر و فن' سپنے سلگتے ہیں

☆

رگوں میں انجمادِ خوں کا کچھ احساس سا اٹھے
کبھی اپنا سراپا خوف کے پیکر میں ڈھل جائے
ردائے آتشیں اوڑھے کوئی سایہ نظر آئے
کوئی آسیب جیسے گھر کے آنگن میں اتر آئے
یہ شہرِ آرزو آتش نفس صحرا نہ بن جائے
یہ خوابوں کا جزیرہ خون کا دریا نہ بن جائے

گلنار آفریں

سمندر اور زندگی

میں آج بے رحم دائرے میں سمٹ گئی ہوں
مرے خیالوں کے تانے بانے الجھ گئے ہیں
دکھوں کے لمحوں کو ساتھ لے کر
دل ونظر کی سکوں کے خاطر
سبک ہواؤں میں سانس لینے
غموں کا اپنے علاج کرنے
ہجوم غم میں گھری ہوئی سی

میں جب سمندر کے پاس پہنچی
تو سوچتی ہوں کہ ساحلوں پر وہ پہلی جیسی
محبتوں کا کہیں بھی احساس کیوں نہیں ہے
قدم قدم پر اداسیاں ہیں
ہوائیں نفرت زدہ سی کیوں ہیں
یہ کیسے شعلے ہیں نفرتوں کے
جو ساحلوں تک پہنچ گئے ہیں
گزر کے ساحل سے جب سمندر کی تہہ میں جھانکا
تو میں نے دیکھا

کہ زندگی تھی نہ زندگی کی کوئی علامت
تو کیا سمندر فنا کی جانب رواں دواں ہے
یہ میری سوچیں مرے خیالات
پھر سے الجھن بڑھا رہے ہیں
مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ڈھلتے سورج کے ساتھ میں بھی
افق کے نزدیک زرد پانی میں
دھیرے دھیرے اتر رہی ہوں
حیات نو کا سراغ پانے
نئی ڈگر سے گزر رہی ہوں

پروفیسر ڈاکٹر توصیف تبسم۔ پروفیسر ڈاکٹر سید محمد عارف

نقد و نظر

نام کتاب: گلہائے رنگ رنگ

مصنفہ : ثاقبہ رحیم الدین

مبصر : ڈاکٹر توصیف تبسم

ملنے کا پتہ : ۹۔ جامی روڈ ' راولپنڈی کینٹ

ضخامت : ۵۷۰ صفحات قیمت : ۴۹۰ روپے

''گلہائے رنگ رنگ'' ثاقبہ رحیم الدین کے مقالات' مضامین اور انشائیوں کا مجموعہ ہے جو اسی سال شائع ہوا ہے' اس سے پہلے ان کے قلم سے متعدد تصانیف منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ بیگم صاحبہ کا تعلق برصغیر کے ایک قدیم علمی و ادبی خانوادے سے ہے' سفر و ادب کا ذوق اُن کو ورثہ میں ملا ہے۔ سماجی' ادبی اور معاشرتی مسائل پر انہوں نے خیال انگیز مضامین سپردِ قلم کیے ہیں۔ بچوں اور خواتین کی فلاح و بہبود اور تعلیم و تربیت کا خیال ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا ہے۔ ادب کی ترویج کے لئے ''قلم قبیلہ'' اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ''چلڈرن اکیڈمی'' جیسے فعال اداروں کے قیام کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ وہ ایک صاحب طرز ادیبہ ہیں' جس کا یقین زیرِ نظر کتاب میں شامل تحریروں کو ایک نظر دیکھ کر ہو سکتا ہے۔

اس کتاب میں جہاں اُردو کے کلاسیکی شعراء' مثلاً غالب' اقبال' حسرت موہانی اور جوش ملیح آبادی کے فکر و فن پر مقالات شامل ہیں' وہیں آج کے دور کے جدید شاعروں اور ادیبوں' مثلاً ممتاز مفتی' مرزا ادیب' نسیم حجازی' اختر ہوشیار پوری' ڈاکٹر وزیر آغا' ڈاکٹر وحید قریشی' محسن شکیل اور اعتبار ساجد کی ادبی کاوشوں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ کچھ مضامین معاشرتی' سماجی اور تعلیمی موضوعات سے متعلق ہیں۔ اس گفتگو سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کا نام ''گلہائے رنگ رنگ'' بہت ہی مناسب ہے' اس کے باوجود کہ اسی نام سے بہت پہلے محمد شمس الحق کے انتخاب اشعار کو نیشنل بک فاؤنڈیشن تین جلدوں میں چھاپ چکی ہے' اس بوقلمونی کے باوجود جو زیرِ نظر کتاب میں پائی جاتی ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ان تحریروں کو ذیلی عنوانات دے کر' ادبی' سماجی'

تعلیمی اور تقریباتی خانوں میں تقسیم کر دیا جاتا' مثلاً اقبال پر لکھے گئے تین مقالات اور ''عمر فاروق اور اقبال شناسی'' بڑی سہولت سے' اکٹھے کیے جا سکتے تھے۔ اس صورت میں مصنفہ کے نقطہ نظر کو سمجھنے میں زیادہ سہولت رہتی۔ آسماں پر بکھرے ہوئے ستاروں کا حسن اپنی جگہ مگر دیکھنے والی آنکھ کو قطاروں میں روشن چراغ شاید ستاروں سے بھی زیادہ خوبصورت محسوس ہوتے ہیں۔ مصنفہ موضوع کی نامیت سے اندازِ تحریر اختیار کرتی ہیں' جہاں ضرورت ہوتی ہے وہ تجزیاتی اور سائنٹیفک پیرایہء اظہار سے کام لیتی ہیں۔ مگر ان کی تحریر کے وہ حصے جو تاثراتی اسلوب میں ہیں' خاص لطف کے حامل ہیں۔ مرزا ادیب کے بارے میں ان کی تحریروں کا لطف اپنی جگہ ہے' یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کوئی داستان پڑھ رہے ہوں۔

اب ایک دو باتیں' کتاب کی طباعت و اشاعت سے متعلق۔ تقریبات سے متعلق رنگین تصاویر جو شاملِ کتاب ہیں' اس کے صوری حسن میں اضافہ کا سبب ہیں۔ کتاب پندرہ کے مسطر پر بڑے پوائنٹ میں کمپوز کی گئی ہے' اگر پوائنٹ چھوٹا ہوتا تو کتاب زیادہ دیدہ زیب ہو جاتی اور اس پر خرچ بھی کم آتا۔ دوم' پروف خوانی میں لاپروائی برتی گئی ہے۔ حصہ نثر میں اغلاط تو گوارا کی جا سکتی ہیں مگر جہاں شعروں میں غلطیاں در آئی ہیں' شعر ناموزوں ہی نہیں ہو جاتا بلکہ اکثر صورتوں میں اُس کی تفہیم بھی دشوار ہو جاتی ہے' مثلاً دیکھئے' کتاب کے صفحات ۱۹' ۲۰' ۲۲' ۱۳۷ اور ۴۶۔ امید ہے اشاعت ثانی کے وقت ان امور کا خیال رکھا جائے گا۔

نام کتاب : اک دیا دریچے میں

شاعر : پرتو روہیلہ۔

ناشر : فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مبصر : ڈاکٹر توصیف تبسم

ضخامت : ۱۳۳ صفحات   قیمت : ۱۸۰ روپے

مختار علی خاں پرتو روہیلہ کا یہ ساتواں شعری مجموعہ ہے' اسی کو محاورہ کی زبان میں ''ہفت خواں'' طے کرنا کہتے ہیں۔ اس مجموعہء شعری کی انفرادیت کے ایک سے زیادہ پہلو ہیں۔ اول تو یہ کہ اس کی ترتیب میں غزلیں اور نعتیں الگ الگ نہیں بلکہ اس طرح ملی جلی ہیں کہ شاعر کی روح کی سرشاری اپنی تمام تر پاکیزگی کے ساتھ' اس کی غزلوں میں نفوذ کر گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرتو کی عام غزلوں کے برعکس' اس مجموعہ میں شامل اُس کی غزلیں ایک خاص ترفع کی حامل محسوس ہوتی ہیں۔

اس ایک لمحہ کا صدیوں سے سلسلہ نکلا   وہ ناشناس تو برسوں کا آشنا نکلا

یہ کل کی بات فلک پر تھے ساتھ ہم دونوں — ہمارا رشتہ تو دنیا سے ماورا نکلا

وہ بلاتا ہے تو چل دیتا ہوں بے سدھ ہو کر — راہ آساں ہے کہ دشوار نہیں دیکھتا ہوں

اس کی طاعت بھی تو میرا ہی شرف ہے پرتو — میں ہوں مجبور کہ مختار نہیں دیکھتا ہوں

مقطع میں 'پرتو کے ساتھ ''مختار'' لکھنا توجہ چاہتا ہے جو شاعر کا نام بھی ہے' اس قرینہ سے انہوں نے دوسری کئی شعروں میں بھی کام لیا ہے۔ پرتو روہیلہ نے پچھلے برسوں میں بڑے تواتر کے ساتھ' غالب کے فارسی خطوط کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ تراجم تین مختلف کتابوں کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ فارسی کے اس گہرے مطالعہ کا بالواسطہ اثر ان کی شعر گوئی پر بھی پڑا ہے۔ وہ شعر کہتے ہوئے' خوبصورت نادر اور بلیغ تراکیب وضع کرتے ہیں' جس سے شاعر' اپنے مافی ضمیر کو کم سے کم لفظوں میں شعری رنگ و آہنگ کے ساتھ اپنے قاری تک پہنچانے پر قادر ہے' یہ تراکیب دیکھیے: ''توفیق آشیاں بہ شاخ برق'' — ''طرح نزدبان'' — ''ضمیر ہست'' — ''نقشِ طلسم جاں'' — ''سپاسِ ہدیہ جاں'' — ''قلزم حسن ذات'' وغیرہ۔

ترکیب سازی کے اس رجحان کے نتیجہ میں' فارسی زبان کی مٹھاس' ان کی غزلوں میں در آئی ہے۔ رواں فارسی تراکیب کے ساتھ شعر لکھتے ہوئے جب کوئی ہندی زبان کا لفظ پرتو کی دوہا نگاری کے زیر اثر' ان کے یہاں آ جاتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی کشیدہ کار نے طلائی چادر پر خوش رنگ نقش بنا دیا ہو۔

مجموعہء شعری میں شامل نظموں اور غزلوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ایک خاص مرحلہ عمر میں پیش آنے والی جذباتی و ذہنی کیفیات کی آئینہ دار ہیں۔ جمال کی صورتیں شاعر کو آج بھی اتنی ہی عزیز ہیں جتنی عنفوانِ شباب کے عہد سرشار میں ہوا کرتی تھیں۔ پرتو کی جمال پرستی' چاہے اور چاہے جانے کی آرزو کا بڑا شاعرانہ اظہار' اس کی نظم' وہ سرو قامت' وہ سرکشیدہ میں ہوا ہے۔ اُس کی غزلیں بھی جمال پرستی کے وصف سے خالی نہیں۔

نام کتاب : اقبالیات اسد ملتانی

مرتب : پروفیسر جعفر بلوچ

ناشر : اقبال اکادمی پاکستان

مبصر : ڈاکٹر توصیف تبسم

ضخامت : ۱۳۶ صفحات — قیمت : ۶۰ روپے

اقبالیات کو اُردو ادب میں ایک مستقل شعبہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس خاص مطالعہ کی ابتداء خود

اقبال کی زندگی میں ہوگئی تھی۔ جب سے اب تک اس شعبہ میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ زیر نظر تالیف بھی اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۸۳ء اور پھر دوبارہ ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی۔ پروفیسر جعفر بلوچ نے اپنی اس تالیف میں' علامہ اقبال سے متعلق جناب اسد ملتانی کی نگارشات نظم ونثر کو یکجا کر دیا ہے' جن میں ان کے قلم سے نکلے تین مضامین اور سولہ ایسی نظمیں شامل ہیں' جن میں شاعر نے اقبال سے اپنی ارادت و عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ یہ امر تحقیق طلب ہے کہ شاید کسی دوسرے شاعر نے اتنی بڑی تعداد میں' اقبال سے متعلق ایسی نظمیں نہ لکھی ہوں۔ اسد ملتانی کی ہر نظم جو انہوں نے اقبال کے بارے میں لکھی۔ دراصل اُس جذباتی اور وجدانی اظہار کی مظہر ہے جو ان کو اپنے استاد سے تھی۔ اسد ملتانی' اقبال کے شاگرد بھی تھے' یہ سعادت بہت کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہے' اسد ملتانی کا شمار ان لکھنے والوں میں ہوتا ہے' جنہوں نے اپنی نظم و نثر کے ذریعہ اقبال کی تفسیر وتوضیح کا اہم کام سرانجام دیا۔ علامہ اقبال سے جناب اسد کی اثر پذیری ہنگامی نوعیت کی نہیں تھی بلکہ اقبال کی قربت نے جو نقش ان کی شخصیت پر ابتدائے عمر میں قائم کیا تھا وہ وقت کے ساتھ مزید گہرا ہوتا چلا گیا۔ جناب اسد ملتانی نے اپنی زندگی میں اپنا کلام مرتب کیا تھا مگر یہ مسودہ تلف ہو گیا۔ جو کچھ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے' وہ جناب اسد ملتانی کی وہ مطبوعہ تحریریں ہیں جو مختلف رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں اُردو ادب کے عام قاری' بالخصوص اقبالیات سے شغف رکھنے والے افراد کو پروفیسر جعفر بلوچ کا مرہون منت ہونا چاہئے کہ انہوں نے' اقبال کے شاگرد رشید اسد ملتانی کی منظوم ومنثور تحریروں کو مربوط انداز میں ہم تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔

اسد ملتانی کو بارہا علامہ اقبال کی محفل میں حاضر ہونے اور ان کی بصیرت افروز گفتگو سننے کا اتفاق ہوا۔ ان محفلوں کی روداد بھی اسد ملتانی نے بڑی تفصیل سے اپنے ان مضامین میں پیش کردی ہے۔ اسد ملتانی کو اپنی زندگی میں بحیثیت شاعر' ایک منفرد مقام حاصل تھا۔ ان کا بیشتر کلام اردو میں ہے' اگر چہ وہ فارسی اور سرائیکی زبان میں بھی لکھتے رہے ہیں۔ ان کا یہ شعر' یقیناً آپ نے بھی سنا ہوگا' مگر کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ شعر' اسد ملتانی کا ہے۔ رہیں نہ رند' یہ واعظ کے بس کی بات نہیں تمام شہر ہے' دو چار دس کی بات نہیں

فاضل مرتب نے ان منتشر تحریروں کو محض یکجا نہیں کیا' بلکہ جہاں ضروری سمجھا' مناسب تحقیقی وتوضیحی حواشی بھی سپرد قلم کردیے ہیں' جن سے تالیف کی افادیت وقدر و قیمت میں مستقل اضافہ ہو گیا ہے۔ جناب اسد ملتانی کا ذوق شعری ایک خاص ماحول کا پروردہ تھا۔ ان کے کلام کو اسی معیار پر کھنا ضروری ہے۔ وہ خود بھی

قدیم وجدید کی فروعی تقسیم کے قائل نہ تھے بلکہ صرف ذوق سلیم کو ادب کے حسن وقبح کا معیار سمجھتے تھے چنانچہ کہتے ہیں: ادب کے حسن کا معیار ہے مذاق سلیم عبث ہے اس میں جدید وقدیم کی تقسیم

نام کتاب : تناظر

مصنف : مُسلم شمیم

ناشر : جاوداں لیزر کمپوزر، کراچی

مبصر : ڈاکٹر توصیف تبسم

ضخامت : ۴۰۶ صفحات قیمت : ۱۵۰ روپے

''تناظر''، مسلم شمیم کے ستائیس (۲۷) تنقیدی ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن لوگوں کے فکر وفن پر انہوں نے اظہار خیال کا ہے، ان میں علامہ نیاز فتح پوری، علامہ جمیل مظہری اور پرویز شاہدی کو چھوڑ کر بیشتر اہل قلم سے ان کے گہرے، ذاتی مراسم ہیں۔ گویا انہوں نے نصف صدی کے ممتاز لکھنے والوں کی فکری اور علمی جہات کا تجزیہ اپنی اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ جناب مسلم شمیم ایک مستند ادبی نقاد اور جانے پہچانے شاعر ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''امکان'' کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ نثر میں ان کی تصانیف ایک سے زیادہ ہیں، جن میں ''آدرش'' ۔ ''شوکت عابدی، فن اور شخصیت'' اور زیر نظر تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''تناظر'' شامل ہیں۔ ان کی شاعری کا دوسرا مجموعہ ''بیان'' کے نام سے اور تنقیدی تحریروں پر مشتمل ان کی تصنیف ''تقریظ'' زیر اشاعت ہیں۔ مسلم شمیم ایک فعال ادبی شخصیت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ متعدد ادبی جرائد سے بحیثیت رکن مجلس ادارت، وابستہ اور مختلف ادبی تنظیموں کے رکن رہے ہیں۔

مسلم شمیم زندگی کے بارے میں رجائی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ان کے افکار اور خیالات میں ایک طرح کی کشادگی پیدا ہوگئی ہے جس کا اثر ان کے ان مضامین پر بھی پڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مضامین خالصاً ادبی ہوتے ہوئے بھی ایک طرح کی روشن خیالی، خرد افروزی اور تعقل پسندی کی ترویج کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعہ سے ایک طرح کا انشراحِ قلب ہوتا ہے، مایوسی اور قنوطیت پیدا نہیں ہوتی۔ جن لوگوں کے فکر وفن کو انہوں نے موضوع بنایا ہے۔ ان میں سے بیشتر ترقی پسندی کے حیات بخش نظریہ سے وابستہ ہیں۔ یہ افراد زندگی کی مثبت قدروں کے امین ومبلغ اور رجائی رجحانات کے حامل ہیں۔

مسلم شمیم کی تنقیدی آراء سائنٹیفک تنقید کا عمدہ نمونہ ہیں۔ وہ جب کسی لکھنے والے کے فکر وفن کا جائزہ لیتے ہیں تو اُس خاص فرد کے ذاتی حالات اس کے عہد کے ملکی اور غیر ملکی اہم واقعات جن میں اس خاص تخلیق کار کی ذہنی نشو ونما ہوئی' بطور خاص پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کے اخذ کردہ نتائج سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے مگر ان کو بیک جنبش قلم رد کرنا' آسان نہیں۔ مضمون نگاری میں جناب شمیم اجمال سے زیادہ طول کلام کے قائل دکھائی دیتے ہیں۔ یہ رجحان غالباً ان کے یہاں' ان کی پیشہ ورانہ زندگی کے زیر اثر پیدا ہوا ہے۔ یعنی وہ پہلے ایک مدرس رہے اور اب ایک وکیل ہیں۔ جناب تابش دہلوی کے بارے میں یہ مضمون' اس اعتبار سے خاصے کی چیز ہے کہ جناب تابش کے بارے میں تمام تاثر یہی ہے کہ وہ اول و آخر ایک شاعر ہیں اور بس۔ اب مضمون کو پڑھنے کے بعد ان کی ادبی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے اور وہ ہے ایک خاکہ نویس اور نثر نگار کا' اس لحاظ سے اس مضمون کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔

''تناظر'' میں جن لوگوں کے فکر وفن کے بارے میں جناب مسلم شمیم نے اظہار خیال کیا ہے' ان میں کثیر تعداد شاعروں کی ہے۔ اپنے نقطہ ہائے نظر کی وضاحت کرتے ہوئے' انہوں نے شعراء کے جس کلام کو اقتباس کیا ہے' اگر صرف اسی کا مطالعہ کیا جائے' تو وہ بھی لطف سے خالی نہیں۔ اس اعتبار سے ''تناظر'' ایک ایسی دستاویز ہے جس میں مختلف شعراء کے کلام کے بہترین اجزاء یکجا ہو گئے ہیں۔

نام کتاب: جہات

نام مصنف: ڈاکٹر محمد علی صدیقی

ناشر : ارتقا مطبوعات' کراچی

مبصر : ڈاکٹر توصیف تبسم

ضخامت : ۲۷۱ صفحات قیمت : ۲۰۰ روپے

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا شمار برصغیر کے مقتدر ادبی نقادوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک کثیر التصانیف مصنف ہیں۔ اب تک ان کے تنقیدی مضامین پر مشتمل چار مجموعے ''توازن'' (۱۹۷۶ء) ۔ ''نشانات'' (۱۹۸۱ء) ''مضامین'' (۱۹۹۱ء) میں اب چوتھا مجموعہ ''جہات'' کے نام سے اسی برس شائع ہوا ہے۔ ان کے اولین مجموعہ مضامین ''توازن'' کو پاکستان رائٹرز گلڈ کا انعام دیا گیا۔ جمال پرست اطالوی نقاد کروچے (۱۸۶۶۔۱۹۵۲ء) کی سرگذشت کے ترجمہ پر بھی ان کو پاکستان رائٹرز گلڈ کے انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔ ان تصانیف کے علاوہ'

ماہنامہ ''افکار'' میں لکھے گئے اپنے اداریوں کو انہوں نے ''اشارے'' کے نام سے ۱۹۹۵ء میں مرتب کیا۔ ''پاکستانیات''۔ ''تلاش اقبال'' اور ''سر سید احمد خاں اور جدت پسندی''۔ ان کی دوسری مطبوعہ تصانیف ہیں۔

''جہات'' میں شامل مضامین ۱۹۹۱ء اور ۲۰۰۳ء کی درمیانی مدت میں لکھے گئے ہیں' جن کی کل تعداد ۳۳ ہے۔ چند ابتدائی مضامین نظریاتی مباحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی خاص عہد میں تخلیق ہونے والے انفرادی اور اجتماعی ادب کی جانچ اور پرکھ کے لئے' نظریہ ایک طرح کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ یہ نثر بارے سائنسی تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ڈاکٹر صدیقی مسائل پیش نظر کے تحلیل و تجزیہ کے لئے ہمیشہ معروضی حقائق کو سامنے رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اخذ کردہ نتائج حد درجہ منطقی اور قابل قبول ہوتے ہیں۔ فاضل تنقید نگار کے خیالات میں چونکہ کوئی ژولیدگی نہیں اس لئے ابلاغ' ان مضامین کی ایک پسندیدہ صفت ہے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے حسب ضرورت تمثیلات سے بھی کام لیتے ہیں۔ جس سے ایک طرف تو لکھنے والے کا نقطۂ نظر واضح تر ہو جاتا ہے' دوسرے تحریر میں ایک طرح کی دل آویزی میں پیدا ہو جاتی ہے۔

''جہات'' میں شامل جو انفرادی مطالعہ ہیں' ذرا ان کے عنوانات دیکھیئے: ''مستنصر حسین تارڑ' آشوب حقیقت کا نوحہ گر''۔ ''مرتضیٰ برلاس' نوائے تلخ کا مُغنّی''۔ ''پروین شاکر'' اثبات ذات کی شاعرہ'' یا ''حبیب جالب' شاعر شعلہ نوا'' ان عنوانات سے ثابت ہے کہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی' کسی شاعر یا ادیب کا مطالعہ کرتے ہوئے' ایسے انفرادی مرکزی نکتہ کی تلاش میں رہتے ہیں' جس کی روشنی میں اس کے تمام و کمال تخلیقی سفر کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اچھی تنقید اگر ایک طرف' ادب پاروں کی تفہیم کا راستہ ہموار کرتی ہے تو دوسری طرف شعر و ادب کے ایک سنجیدہ قاری کے شوق مطالعہ کو مہمیز بھی کرتی ہے۔ ''جہات'' میں شامل' تنقیدی مضامین یہ فریضہ بطریق احسن پورا کر رہے ہیں۔

نام کتاب: بیوی سے چھپ کر

شاعر : سید معراج جامی

ناشر : بزم تخلیق ادب پاکستان' کراچی

مبصر : ڈاکٹر توصیف تبسم

ضخامت : ۱۹۲ صفحات قیمت : ۱۵۰ روپے

''بیوی سے چھپ کر'' سید معراج جامی کی مختصر نظموں ''سین ریو'' کا اُردو میں اولین مجموعہ ہے۔

اُردو میں اخذ وقبول کی داستان خاصی طویل بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ ابتداء میں جن شاعروں نے اردو میں طبع آزمائی کی' وہ فارسی عروض وبحور' اصناف شعری اور اصول شعر کو پہلے ہی سے برتنے والے تھے۔ لہٰذا انہوں نے وہی بنے بنائے اصول شعر اور انھیں فارسی اصناف کو اُردو میں رائج کرنے کی کوشش کی جو اس وقت کے پڑھے لکھے اور ادب پسند طبقہ کے لئے اجنبی نہیں تھے۔ ان اقدامات نے اُردو شعر گوئی کو بنیاد فراہم کی۔ آج بھی اُردو شاعری اسی راستے پر گامزن ہے جو ان صاحبان فن نے متعین کیا تھا۔ بعد کے زمانے میں جدت پسند اور اظہار میں وسعت کے متلاشی شعراء نے ہندی ادب سے گیت' دوہے' فرانسیسی ادب سے نظم آزاد اور ترائیلے' انگریزی ادب سے سانیٹ' کیٹو اور جاپانی ادب سے' ہائیکو' سین ریو وغیرہ کو اردو میں رائج کرنے کی کوشش کی۔ ''ہائیکو'' کو جاپانی شاعری میں وہی اہمیت ہے جو ہمارے یہاں اُردو غزل کو حاصل ہے۔ ''ہائیکو'' اور ''سین ریو'' دونوں سہ مصرعی ہیئت میں مختصر نظموں کے نام ہیں۔ ہیئت اور ارکان شعر کے لحاظ سے ''ہائیکو'' اور ''سین ریو'' میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں میں وہی ۵۔ ۷۔ ۵ ارکان کی پابندی کی جاتی ہے۔ اگر کوئی فرق ہے تو وہ موضوع اور مزاج کا ہے۔ ہائیکو کے موضوعات سنجیدگی لئے ہوئے جبکہ ''سین ریو'' طنز ومزاح کا حامل ہوتا ہے' اس کا مطلب یہ ہوا کہ سین ریو کا ایک پہلو دلچسپی کے علاوہ' معاشرتی اصلاح بھی ہے۔ سید معراج جامی' ایک پہلو دار شخصیت کے مالک ہیں۔ ہائیکو اور سین ریو نگاری کے علاوہ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ ''روزن خیال'' ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ وہ لندن سے نکلنے والے سہ ماہی ادبی رسالہ ''سفیر اردو'' کے مدیر بھی ہیں۔ ان کے علاوہ' بیرون ملک اور پاکستان میں متعدد ادبی رسائل ان کی ادارت میں شائع ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ افسانہ نگار اور صحافی بھی ہیں اور ادبی نقاد بھی۔ لیکن اُردو شعر وادب سے ان کا تعلق ان کی پہلی محبت ہے۔ زیر نظر مجموعہ شعری میں ۳۴۶ سین ریو ہیں موضوع کے اعتبار سے ان مختصر نظموں میں خاصا تنوع موجود ہے۔ حمد ونعت کے علاوہ' پنجابی سین ریو اور چھ جاپانی سین ریو کے اردو میں تراجم بھی شامل کتاب ہیں۔ ترجمہ سے شاعر کی مشق ومہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ترجمے اتنے رواں دواں' مکمل اور تاثیر سے بھرپور ہیں کہ ان پر طبع زاد ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

انگریزی میں جو ''سین ریو'' دیئے گئے ہیں' ان میں قافیہ نہیں' جبکہ ترجمہ میں قوافی کا التزام کیا گیا ہے' جس سے ترجمہ اصل سے بھی زیادہ دلپذیر ہو گیا ہے۔ حصہ شعر سے پہلے مختلف صاحب الرائے اہل قلم کے آٹھ

مضامین بھی کتاب میں شامل کیئے گئے ہیں' جن سے اس نسبتاً غیر مانوس صنف شعر کی تفہیم آسان ہوگئی ہے۔

ہم مشرق کے رہنے والے' دروں میں ہیں اور طول کلام سے زیادہ اختصار پسند ہیں۔ دوہا اور غزل کے شعر کی مقبولیت اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہائیکو ہو یا سین ریو' یہ اصناف ابھی تک اپنے مقام کی تلاش میں ہیں' لیکن ان کا مختصر پیرائیہ اظہار مستقبل میں ان کی مقبولیت کا سبب بن سکتے ہیں۔

نام کتاب : مشاہدے

مصنف : وزیری پانی پتی

ناشر : بزم تخلیق ادب پاکستان' کراچی

مبصر : ڈاکٹر توصیف تبسم

ضخامت : ۲۶۴ صفحات قیمت : ۱۵۰ روپے

وزیری پانی پتی کے لکھے ہوئے' ان مختصر تنقیدی مضامین کی کل تعداد ۳۳ ہے' جس میں نقاد' افسانہ نگار بھی شامل ہیں اور شاعر بھی۔ شاعروں کی تعداد' نثر نگاروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ ایک اور فرق یہ بھی ہے کہ جہاں نثر نگاروں میں سکہ بند ناقدین ادب مثلاً محمد حسن عسکری' ڈاکٹر وزیر آغا اور ممتاز شیریں کی تحریروں کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے' وہیں نسبتاً ایسے شاعروں کی تعداد ان کے یہاں خاصی ہے جن کی شاعری کو عموماً نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ ۲۳ شاعروں کے بارے میں جو مضامین شامل کتاب ہیں وہ دوسرے مضامین کے مقابلہ میں زیادہ قابل مطالعہ اور دلچسپ ہیں کیونکہ فاضل نقاد نے ان کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے' ان کے کلام کے بہترین اجزاء کو یکجا کر دیا ہے۔ جدید شعراء میں رئیس فروغ کے بارے میں تین اور شکیل احمد ضیاء کے بارے میں دو مضمون شامل کتاب ہیں۔ وزیری پانی پتی کی تالیفات میں رئیس فروغ کے بارے میں ایک مستقل کتاب بھی ہے جس کا نام 'رئیس فروغ' برزخ کے وی آئی پی روم میں ہے۔ رئیس فروغ سے ذہنی اور جذباتی قربت کا اندازہ کتاب کے انتساب سے بھی ہوتا ہے جو اس ذہین اور ہنرمند شاعر کے نام کیا گیا ہے۔

وزیری پانی پتی شاعر بھی ہیں' مدیر بھی اور نقاد بھی۔ بحیثیت نائب مدیر' وہ ماہنامہ ''جام نو''۔ ماہنامہ ''عکس لطیف'' ''ماہنامہ طلوع افکار'' کتابی سلسلہ ''دریافت'' اور علامہ نیاز فتح پوری کے موقر علمی و ادبی جریدہ ''نگار

پاکستان'' سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''آنکھوں سے آکاش تک'' شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔

ادب کی مختلف اصناف میں تنقید کی افادیت کئی پہلو رکھتی ہے۔ اس میدان میں جہاں لکھنے والا' اپنے مافی ضمیر کو بے کم و کاست سامنے لاتا ہے' وہیں ادب کے ایک عام قاری کی ذہنی تسکین کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔ تنقید کا بنیادی فریضہ قاری اور تخلیقی فن کار کے درمیان رابطہ کو بحال کرنا اور ادب پارے کی بہتر تفہیم کے لئے راستہ ہموار کرنا بھی ہے۔ وزیری پانی پتی کے یہ مضمون' تنقید کا یہ بنیادی فریضہ بطریق احسن پورا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وزیری کے خیالات میں چونکہ کوئی الجھاؤ اور ژولیدگی نہیں اس لئے ان کے ان مضامین کی تفہیم و ابلاغ کا دائرہ وسیع تر ہے' وہ جس بات کو درست جانتے ہیں' اس کو ایک خاص جرأت کے ساتھ پیش کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں' کتاب میں شامل مضامین پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ صاحب کتاب ایک وسیع مطالعہ شخص ہیں۔ عتیق احمد نے تنقید لکھنے کے لئے' کثرت مطالعہ کو ایک بنیادی شرط قرار دیا ہے' وہ لکھتے ہیں:

> ''وسعت اور کثرت مطالعہ' تنقید نگاری کی ضرورت بھی ہے اور اس کا قرض بھی' لیکن اس مطالبہ کے ساتھ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مطالعہ کی جہت میں اگر تنوع نہ ہو تو تنقید لکھنے والا ایک ہی دائرہ میں گھر کر رہ جاتا ہے۔''

وزیری پانی پتی کی تنقیدی نگارشات جو ان کی زیر نظر تصنیف میں شامل ہیں' تنقید نگاری کی اس بنیادی شرط کو کماحقہ پورا کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

کتاب : بیعت

مصنف : جعفر بلوچ

مبصر : پروفیسر ڈاکٹر سید محمد عارف

پروفیسر جعفر بلوچ کے اس مجموعۂ نعت کا آغاز ہی بڑا چونکا دینے والا اور عام نعتیہ کلام کے مقابلے میں بڑی انفرادیت لئے ہوئے ہے۔۔۔ ''مطلع'' کے عنوان سے شاعر نے اپنے بچپن کی یادوں کے حوالے سے دریائے سندھ کی روانی اور وسعتوں کو بڑی خوبصورتی سے منعکس کیا ہے۔۔۔ یہ دریا جسے کہیں شیر دریا' کہیں مہران اور کہیں سندھو کے نام سے پکارا جاتا ہے جعفر بلوچ نے اسے مقامی زبان میں ''دھارا'' یعنی دریا

اور اس وسیع دریا کے لئے "سائیں دھارا" کی خوبصورت ترکیب استعمال کی ہے۔ اس لفظ میں سادگی اور بھرپور محبت کا وہ تصور موجود ہے جو اس دریا کے کنارے رہنے والوں کے رگ و پے میں شامل ہے۔۔ دریا کے اس بہاؤ کے ساتھ ساتھ شاعر بڑی عمدگی سے قاری کو فکر و تخیل کے اس بہاؤ کی طرف متوجہ کرتا ہے جو اس کے شعر و سخن کی صورت میں رواں دواں ہے۔ اور۔۔ شعر کی یہ روانی اس جذبۂ عشق رسول ﷺ کی مرہون منت ہے جس سے اس کا نعتیہ دیوان مزین و معطر ہے۔۔۔ یوں شاعر وادئ سندھ سے نکل کر وادئ بطحا میں جا نکلتا ہے اور اپنے ساتھ قارئین کو بھی اس جادۂ محبت میں اپنا شریک سفر کر لیتا ہے۔ جعفر بلوچ کا یہ خاص انداز ہمیں سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔۔

اپنی یادوں کے حوالے سے شاعر کا انداز سادہ بھی ہے اور والہانہ بھی

چمک اٹھتے ہیں جب یادوں کے روزن — گلے ملتے ہیں، میں اور میرا بچپن

وہ شہر اک، سندھ کے شرقی کنارے — وہ جس کے اک طرف تھل کے نظارے

ایسے میں وہ دریا اس کا ساتھی رہا جسے: — کہا دھاروں نے اس کو سائیں دھارا

اور پھر دریا کے ذکر سے گریز کرتے ہوئے دریائے شعر کی طرف یوں متوجہ کرتے ہیں کہ:

سنو اب ایسے دریا کی کہانی — بھرے ہے جس کے آگے سندھ، پانی

پانی بھرنے کے محاورے کا استعمال بھی داد طلب ہے۔۔ پھر اپنے جذبات و احساسات اور زبان و بیان کی عمدگی کا تذکرہ، جس پر خود ان کے کلام کی پختگی دلالت کرتی ہے۔۔ اور پھر اپنی شاعری کی تاثیر کا راز بتاتے ہیں کہ: یہ فیضانِ ثنائے مصطفیٰ ؐ ہے

جعفر بلوچ کی نعت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ عام نعت گو شعرا کے برعکس حضور ﷺ کے صرف سراپا سے زیادہ ان کے اوصاف حمیدہ اور ان کمالات برگزیدہ کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کی سخاوت، عدل، بت شکنی، شفقت اور تربیت کے بے مثال انداز کو سراہتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں

بنیں ہم سیرت اقدس میں ڈھل کر — ابو بکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ

نعت سے پہلے حمد میں بھی حق تعالیٰ کی ربوبیت کا ایک گہرا تصور دل پر بیٹھتا ہے۔

کرتا ہے اہلِ درد کی دل بستگی وہی — دیتا ہے ظلمتوں میں ہمیں روشنی وہی

انہوں نے حضور ﷺ کو محسنِ انسانیت کی حیثیت سے نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے:

رموز و اسرارِ صفت افلاک تک رسائی ہے مشتِ گِل کی   عطا کئے ایسے ارتقائے بشر کے زینے مرے نبی نے

آپ کی سیرت کے پیش نظر ایک نعت میں اس قول مبارک کو مرکز توجہ بنایا ہے جس میں فقر کو اپنے لئے باعث فخر بتایا ہے: الفقر فخری۔ اور اس کو کہیں ''گنج خطیر سلام و امان'' کہا ہے اور کہیں ''فلاح وسعادت کا دیوان''۔ وہ نعت گوئی میں مسلمانوں کے مختلف مسالک کے نقطۂ ہائے نظر سے قطع نظر صرف حضورؐ کی ذات والاصفات سے محبت، ان کی غلامی کو بادشاہت، انہیں شافع محشر، ساقی کوثر اور دین و دنیا میں کامیابی کا وسیلہ انہی کی ذات کو قرار دیتے ہیں اور یوں کہتے ہیں:

غلام آقائے دو جہاں ہوں، مجھے غرض کیا ہے اس سے جعفر

کہ ہیں زیادہ وہ نور ذات وصفات میں یا بشر زیادہ؟

ان کے نزدیک تو:

وہ عشق انتساب جسے ہے حضور سے   ہے معتبر بھی اور فنا ناپذیر بھی!

یہ عشق وہ ہے جس کی بنیاد عمل ہے-- ان کا کہنا بالکل درست ہے کہ اس عشق کے وسیلے سے حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی ایک جھلک بھی کسی میں آجائے تو وہ انسان پارس کا ہو جاتا ہے:

پڑا ہو جن پہ خورشید رسالت کا ذرا پرتو   وہ ذرے اوج عظمت پر بہر عنواں چمکتے ہیں

ان کے نزدیک سبز گنبد، امن و آشتی کی علامت، ذات اقدس، خیر کثیر کا سرچشمہ، ان کا اسوہ حسنہ انسانیت کے لئے باعث فلاح ہے۔ انہوں نے بڑے دلنشین انداز میں سرکار دو عالم کے وہ واقعات بھی نظم کیے ہیں جن سے ان کی عزیمت، عدل، اعلان نبوت کی مقدس منظر کشی بہت عمدگی سے ہوتی ہے-- غالبؔ کے نعتیہ اشعار پر تضمین خاصے کی چیز ہے۔ غرض، ان کے ہاں اس جذبۂ عشق کا وہ تصور ملتا ہے جس سے مسلم امہ کی تقدیر بدل سکتی ہے-- یوں ان کا نعتیہ مجموعہ ''بیعت'' ان کے نظام فکر کا مربوط سلسلہ نظر آتا ہے-- جسے پاکستان کے نظریاتی استحکام کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایسے فکر و تخیل کا فروغ وقت کی ضرورت ہے۔

مراسلات

گفتار خیالی، مظفر گڑھ

''سہ ماہی الاقرباء'' اپریل تا جون ۲۰۰۴ء کا شمارہ کل مل گیا ہے۔ آپ کی فقیر نوازی کا بہت بہت شکریہ۔ ''الاقرباء'' کی صوری اور معنوی حیثیت قابل ستائش ہے۔ وہ بھی آپ کی اور دیگر عملے کی کوششوں سے۔ اس گئے گزرے دور میں مکمل ادبی رسالہ نکالنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ رسالے کے مندرجات سرسری طور پر دیکھے۔ اردو میں ''تنقید نگاری کا ارتقاء'' افشاں قاضی؛ ''اردو کی بنیادی لسانی خصوصیات'' ڈاکٹر عطش درانی؛ ''نروان'' محمود اختر سعید کا افسانہ اور منظومات میں ''مدحت خیر الانامؐ'' عبدالعزیز خالد؛ ڈاکٹر خیال کی ''حسین شناسی'' اور ''دھنک رنگ'' پسند آئی ہیں۔ غزلیات میں مشکور حسین یاد، پرتو روہیلہ، منصور عاقل، توصیف تبسم اور خیال امروہوی سرفہرست ہیں۔

حمایت علی شاعر۔ کراچی

دو مہینے سے کراچی میں ہوں، مگر طبیعت ناساز رہی۔ کسی کو خط بھی نہ لکھ سکا۔ ہر بار ارادہ کیا، پھر قلم ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ دو ہفتے سے طبیعت بحال ہے۔ ریڈیو کے احباب نے ایک مصروفیت حوالے کر دی ہے۔ آج سے ۲۵ سال پہلے ٹی وی سے ایک سلسلہ وار پروگرام شروع کیا تھا۔۔ ''خوشبو کا سفر'' جس میں پاکستان کی علاقائی زبانوں کے شعرا کا اردو کلام منتخب کیا جاتا تھا اور کسی اچھے موسیقار سے دھن مرتب کر کے کسی اچھے گلوکار سے گوا دیا جاتا تھا۔ میں اس شاعر کے ہم عصر اردو شعرا کا جائزہ لیتے ہوئے اس علاقائی شاعر کے بارے میں تھوڑی سی معلومات فراہم کر دیتا تھا۔ یہ سلسلہ بہت مقبول رہا۔ قومی یک جہتی کے سلسلے میں، میں نے اس قسم کے اکثر پروگرام ٹی وی اور ریڈیو پر پیش کیے تھے۔ ایک سلسلہ سندھ کے شعرا کے تعلق سے ''محبتوں کے سفیر'' کے عنوان سے مہینوں پیش ہوتا رہا۔ پھر نعتیہ شاعری کے سات سو سال کا انتخاب۔۔ پاکستان تک' (جو کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے) آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا۔ اس میں بھی علاقائی شعراء کی اردو نعتیں منتخب کی گئی تھیں۔

ایک سلسلہ اور بھی مرتب کر رکھا ہے۔ (ابھی ٹی وی کے زیرِ غور ہے) ''نشید آزادی'' تحریک آزادی میں اردو شاعری کا حصہ۔۔۔دیکھیے کب شروع ہوتا ہے۔

اب ریڈیو والوں نے علاقائی شعرا کے بارے میں ایک فرمائش کی۔ اس میں مختلف پاکستانی زبانوں کے شعرا اور ان کے تراجم پیش کیے جائیں گے تا کہ دوسری زبانوں سے ہمیں عمومی آگاہی حاصل ہو جائے۔

رحمان بابا۔۔۔اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ آپ کو اس کی ایک نقل بھیج رہا ہوں۔ ریڈیو سے نشر ہو چکا ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں 'ریڈیو' 'کانوں سنی'' کے مصداق ہوتا ہے۔ مطالعہ اور ہوتا ہے۔ یہ نظر سے دیکھنے کے مترادف ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ مضمون شائع فرمادیں۔ میں پھر ''الاقرباء'' میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ بہت دن دور رہا۔ آخر زندہ بھی تو رہنا ہے۔ اور وہ دوستوں ہی کی رفاقت میں ممکن ہے۔ ایک بار اور۔۔ میں کل پھر امریکہ جا رہا ہوں۔ اگلے ماہ وہاں ایک عالمی اردو کانفرنس ہو رہی ہے۔ آپ کو کینیڈا سے خط لکھوں گا۔

سرور انبالوی۔ راولپنڈی

گزشتہ ماہ (اپریل) کے آخری عشرہ میں ساحر لدھیانوی کے ۸۳ویں یوم پیدائش پر منعقد ہونے والے انڈو پاک مشاعرہ میں شرکت کے لئے بھارت جانا ہوا۔ وہاں یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ ہندو شعرا بھی اردو میں بڑی اچھی شاعری کر رہے ہیں اور ہندو اور سکھ بڑی بے تکلفی سے اردو بول رہے ہیں اور بازاروں میں بھی دکاندار بلا تکلف اردو بول رہے ہیں۔ کسی جگہ بھی ہمیں زبان کا مسئلہ پیش نہیں آیا اور پھر حیرانی بلکہ خوشی کی بات یہ ہے کہ نہرو ہال جس میں مشاعرہ منعقد ہوا سامعین (خواتین و مرد) سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور اچھے شعر کی دل سے داد دیتے رہے اور سامعین مشاعرہ کے اختتام تک جم کر بیٹھے رہے۔ درمیان میں کوئی اٹھ کر نہیں گیا اور نہ ہی کسی قسم کی ہوٹنگ یا ہلڑ بازی ہوئی۔

مسلم شمیم۔ کراچی

سہ ماہی الاقرباء کا تازہ شمارہ (اپریل۔ جون ۲۰۰۴ء) موصول ہوا۔ ابھی سرسری جائزہ لیا ہے۔ تفصیلی مطالعہ کے بعد آپ سے رجوع کرنے کی نیت ہے۔ سردست یہ عرض کرنا ہے کہ پرچہ خوب سے خوب تر کی منزل کی طرف گامزن ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ پیش رفت کا سفر جاری رہے۔ یہ چند سطریں رسید کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ اپنی ایک غزل اور ایک نظم بھی منسلک کر رہا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ مظہر جمیل

صاحب سے گاہے گاہے آپ کا ذکر خیر رہتا ہے۔ ماضی قریب میں ''آشوب سندھ اور اردو فکشن'' کے نام سے ان کی ایک دقیع کتاب شائع ہوئی تھی اور جدید سندھی ادب پر ایک جامع کتاب کی تصنیفی مصروفیت سے دوچار ہیں۔ ''تناظر'' کے نام سے تنقیدی مضامین کا مجموعہ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ یہ میری تازہ ترکاوش ہے۔

نغمہ زیدی۔ پشاور

''الاقرباء'' کا تازہ شمارہ ملا۔ تمام مضامین و غزلیات عمدہ تھے۔ سرورق دیدہ زیب تھا۔ پرچہ روز بروز ترقی کی جانب رواں دواں ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے کہ منافقتوں کے اس دور میں صداقتوں کا پرچار آپ کا مطمح نظر ہے۔ ایک مضمون ارسال خدمت ہے۔ تمہید گرچہ قدرے طویل معلوم ہوتی ہے تاہم معلومات افزا ہے۔ باقی آپ کو اختیار ہے۔ امید ہے شامل اشاعت فرمائیں گے۔

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی۔ ملتان

آپ نے شیوۂ طلب ترک کر کے روشِ صبر اختیار کرلی۔ اس کا پھل آپ کو یہ ملا کہ میں آج ڈھیروں ندامتوں کے ساتھ آٹھ عدد تحریریں بھیج رہا ہوں۔ حمد'نعت'غزل'نظمیں'مزاحیہ'انشائیہ اور تحقیقی مقالہ (نعت بغور پڑھیے' جدید لہجے کی نعت ہے اور عصرِ جدید کے سائنٹیفک حقائق کی آئینہ دار ہے) -- چند دن پہلے اسلام آباد سے شاہدہ لطیف کا سفرنامہ یہ ایں فرمائش پہنچا کہ اس پر تبصرہ لکھ دیجئے۔ میں نے لکھ کر بھیج دیا۔ وہ الاقرباء کے لئے آپ کو دیں گی۔ اس طرح میری تحریریں نو ہوگئیں۔

سید مرتضیٰ موسوی۔ اسلام آباد

''الاقرباء'' کا اپریل' جون ۲۰۰۴ء کا شمارہ نظر نواز ہوا' جس میں میرے مقالے کی نمایاں اشاعت کے لئے شکر گزار ہوں' اس دفعہ ''معاصر فارسی ادب میں پاکستان شناسی'' کے موضوع پر مضمون ارسال خدمت ہے۔ حالیہ شمارے میں فارسی اور اردو ادب کے علاوہ اقبال فہمی کے موضوع پر معلومات افزا مقالے شامل اشاعت ہیں جن میں اردو رباعی میں فارسی رباعی کے تراجم' شمس العلماء حضرت حسن نظامی دہلوی اور اقبال کا نظریہ تعلیم' یقیناً باذوق قارئین نے پسند کیے ہوں گے۔ آخر الذکر موضوع پر آج کل نصاب کے حوالے سے جو بحث چل رہی ہے' اس کے پس منظر میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلام تعلیم و تربیت کے بارے میں

ہمیں واضح ہدایات دیتا ہے۔ اقبال نے اسی سرچشمے سے فیض حاصل کر کے نظم و نثر میں اپنے افکار کو قلمبند کیا ہے۔ شعری حصے میں حمد و نعت، سلام و منقبت ایمان افروز رہے۔ اس دفعہ نقد و نظر کے ضمن میں صادق نسیم کی کتاب ''روشنی چراغوں کی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے فاضل مبصر نے دلچسپ پیرایے میں خاکہ نگاری کر دی ہے۔ دیگر مبصرین نے بھی حق مطلب ادا کیا ہے اور بعض مراسلات میں علمی نکات زیر بحث آئے ہیں جن سے ادب شناس قارئین یقیناً محظوظ ہوں گے۔

پروفیسر آفاق صدیقی۔ کراچی

صرف معذرت خواہ نہیں معافی کا خواستگار ہوں کہ آپ کی نوازشات پیہم جاری و ساری ہیں اور میں کچھ ایسا رہین ستم ہائے روزگار ہوں کہ سہ ماہی الاقرباء جیسے 'ارمغانِ محبت' کا شکریہ ادا کرنے کے لئے بھی کچھ وقت نہیں نکال پایا۔ ''خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں''

بس ایک گزارش کہ ذرا نصابی کتابوں کے جھمیلے سے فرصت پا جاؤں تو انشاءاللہ ''الاقرباء'' کے لئے پابندی سے مضامین تازہ پیش کرتا ہوں رہوں گا۔ ایسے وقیع ادبی جریدے میں شامل اشاعت ہونا واقعی بڑے اعزاز کی بات ہے خصوصاً آپ کی پرخلوص شخصیت میں جو پُرمحبت مقناطیسیت ہے اس کا عکس جمال ہر شمارے میں جلوہ گر رہتا ہے۔ ماشاءاللہ قلمی معاونین میں بڑے باکمال اہل قلم شامل ہیں اور یہ جریدہ نہ صرف صوری ذوق جمال کو تقویت دیتا ہے بلکہ معنوی حسن کاری کے محاسن بھی رکھتا ہے۔

پروفیسر خیال آفاقی۔ کراچی

الاقرباء کے زیر نظر شمارے میں، میرے مراسلے کے ذیل میں بصورت ادارتی نوٹ میرے اس جمہوری حق پر قدغن لگائی گئی ہے کہ میں الاقرباء میں شائع ہونے والے شعری ادب کو نا قابل رشک خیال کرتا ہوں۔ آپ کی طرح میرے لئے بھی یہ امر باعث استعجاب ہے کہ میری ذاتی رائے (پسند ناپسند) کو سیاق و سباق سے ہٹ کر دیکھا گیا ہے۔ حالانکہ میری گزارش کا مطلب یہ تھا کہ ''جیسا ہونا چاہیے ویسا نہیں'' یا یہ کہ جو معیار نثری حصے کا ہے وہ حصہ نظم میں نہیں پایا جاتا۔ میں نے عرض کیا تھا!

''الاقرباء جس خدوخال کے ساتھ نظر آتا ہے بہت خوب ہے تاہم خوب سے خوب تر کا تقاضا ہے کہ اس پر مزید توجہ دی جائے خصوصاً نظم کا حصہ خاصی توجہ اور اصلاح کا محتاج ہے''۔

ہرگز ہرگز میرا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں تھا بلکہ الاقرباء میں شائع ہونے والے تمام اہل ادب بشمول بقول آپ کے میرے ''ہم تخلص ڈاکٹر صاحب'' میرے لئے نہایت محترم اور عزیز ہیں تاہم اگر ''پسند اپنی اپنی اور خیال اپنا اپنا'' کے جمہوری حق کو استعمال کرتے ہوئے میرے کسی ایک حرف سے بھی کسی کی دل شکنی ہوئی ہے تو میں دل کی گہرائیوں سے معذرت کا خواستگار ہوں۔ اس لئے کہ دنیائے شعروادب کی لطافت جنگ وجدل کی متحمل نہیں ہوسکتی اور ادب کے کچھ ''جنگی نامہ نگار'' جو ادبی معرکہ آرائیوں کی روداد بڑے فخر سے اور چسکے لے لے کر بیان کرتے ہیں تو وہ انہی کو مبارک۔

ادارتی نوٹ میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ ''میں ان اشعار کی نشاندہی کروں جو مجھے غیر معیاری محسوس ہوئے'' تو میں تعمیل ارشاد سے معذرت خواہ ہوں کہ اس طرح اور بھی نگاہ یاراں میں گنہگار ٹھہروں گا۔ تاہم پسندیدہ اور اچھے اشعار کی طرف اپنے مراسلے میں اشارہ کر چکا ہوں۔ اسی ضمن میں خود میری غزل کا حوالہ دیتے ہوئے بڑی لطیف نشتر زنی کی گئی ہے کہ ''کیا دیگر کہنے والوں کو کہا جائے کہ وہ میرے اشعار کو بطور نمونہ سامنے رکھیں''۔ تو یقیناً میں نے کبھی آبرو باختہ شعر نہیں کہے' لیکن ساتھ ہی کبھی اکملیت کا دعویٰ نہیں کیا کیونکہ وہی چیز دوسروں کے لئے مثال ہوتی ہے جو کامل ہو' تاہم اپنی سی کوشش کرتا ہوں کہ شاعری کو اس بازار سے نکال کر شریفوں کی بستی میں ایک عزت دار مقام دلا سکوں۔ پھر بھی سمجھتا ہوں کہ مجھ پر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وماعلینا الا البلاغ کے اصول پر عمل کروں۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے اپنے رسول' ہادیٔ اعظم کو بھی یہ فرما کر تسلی دیدی کہ ''اے نبیؐ آپ دل میں میل مت لائیے کہ ہم نے آپ کو لوگوں پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا (ترجمہ) لہٰذا حق پہنچنے والے کا کام بس اتنا ہی ہے کہ وہ کہہ دے اور بس--

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں   بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز

پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہوی۔ لیہ (پنجاب)

زیر نظر الاقربا کے شمارے میں اداریہ بعنوان بین المملکتی ادب بے حد علمی و ادبی سوچ کا نچوڑ ہے' علاوہ ازیں محققین با تمکین کے جتنے مقالات اس شمارے میں ہیں ان کی تحقیق اور آپ کے حسن انتخاب کے بے نظیر مرقع ہیں۔ ہم نے جب سے تخلص خیال تجویز کیا تو ایک عزیز نے پوچھا یہ تخلص کیوں پسند آیا۔ جواب دیا مرزا غالب کے ایماء پر رکھ لیا۔ بقول حضرت غالب عالم تمام حلقہ دام خیال ہے۔ گویا یہ بھی محض خیال ہے کہ

خیال بھی کوئی شے ہے۔ وجود سے قبل اور آخر کا تصور بھی خیال ہے۔ تاہم ۱۹۶۰ء کے بعد اس قدر ہم تخلص پیدا ہوئے کہ اپنی پسند اور غالب کے فلسفے کی ایسی تیسی ہوگئی۔ ہم نے تو اپنے تخلص کی توجیہہ کر دی اب جن احباب نے لفظ خیال کو پسند کیا بہر حال یہ سب عزیز اس امر وہوی خیال نہیں ہو سکتے کیونکہ خیال ہونے کے لئے ازحد بدحال ہونا ضروری ہے۔

زیر نظر الاقربا کے شمارے میں صفحہ ۱۲۳ پر جناب پروفیسر خیال آفاقی کا خاکسار کے بارے میں تبرا نامہ اور آپ کی جانب سے ولا نامہ پڑھا۔ اردو ادب میں چند الفاظ و اصطلاحات ایسی ہیں جو اصول ایماء کے طور پر استعمال ہوتی رہتی ہیں۔ جب ہم شراب معرفت کہتے ہیں تو اس کا مطلب ''مری بروری'' کی ساختہ شراب نہیں بلکہ ایک ایسے محلول کو شعر میں غیر ارادی طور پر استعمال کیا جاتا ہے جو مخصوص کیفیت کا حامل ہے۔ ظاہر ہے شاعری میں 'چائے' 'سگریٹ' علامت اور اظہار کیفیت کے لئے استعمال نہیں ہوتے۔ جب شاعر چہرۂ زیبا پر رنگِ ارغوانی دیکھتا ہے تو یہ نہیں کہتا کہ محبوب کا چہرہ شربت روح افزا کا رنگ لئے ہوئے ہے بلکہ اس کے لئے ہم نے صہبا' رحیق' صبوحی' آتشِ سیال جیسی ترکیبیں گھڑ رکھی ہیں جو اب جدید شاعری سے خارج ہوتی جا رہی ہیں کیونکہ اب جمالیات کا نقطہ نظر محض رنگ اور کیفیت نہیں رہ گیا بلکہ (SEX) ہو گیا ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ جنسیات بھی مکروہ ہے تو پھر پیٹ کی بھوک پر بھی لعنت بھیجنی چاہئے۔

غالب کی عظمت کے سلسلے میں ہم نے جو شعر کہے وہ ان کے شرابی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ وجدانیات Intuition کے حوالے سے ہو گئے۔ اگر غالب مرحوم کے خطوط کے حوالے سے بات کی جائے تو موصوف نے خود اس کا اظہار کیا کہ ان کے اشغال میں مطالعہ کتاب' جرعہ شراب اور تلے ہوئے کباب بھی شامل تھے۔ اب ہمیں کیا پتہ کہ وہ اپنی غربت و عسرت میں ان لوازم کو کس طرح پورا کرتے تھے۔ تو یہ لوازم ان کی عظمت وغیرہ میں اضافہ نہیں کرتے بلکہ ان کی زندگی کے اجزاء و لوازم کو ظاہر کرتے ہیں۔

بہر حال پروفیسر خیال آفاقی صاحب کا ازحد شکریہ کہ موصوف نے ہمیں لعنت ملامت کے لائق سمجھا ورنہ آج کسے فرصت کہ یہ کار خیر بھی انجام دے۔ راقم چونکہ فرقہ ملامتیہ سے تعلق رکھتا ہے یعنی اپنی ملامت پڑھ کر یا سن کر ناراض کی جگہ ایک گونہ خوشی ہوتی ہے کہ نادانستگی بھی کتنا خوبصورت حربہ ہے جس سے اپنی آلائشوں کا پتہ چل جاتا ہے۔

الاقرباء میں راقم کی تصنیف سوشلزم اور عصری تقاضے پر ادارے کی جانب سے بلیغ تبصرہ پڑھ کر

حوصلہ ہوا کہ محنت رائیگاں نہیں جاتی اور مبصر محمود اختر سعید صاحب کی سیکولر سوچ اور تنقیدی نقد و جرح سے استفادہ ہوا۔ راقم کے نئے مجموعہ مقالات شمولہ ماہنامہ سپوتنک بابت مئی آپ کی خدمت میں ارسال ہو چکے ہیں۔ امید ہے آئندہ شمارے میں تبصرہ شائع ہو سکے گا۔ جس سے معلومات میں اضافہ ممکن ہوگا۔ نئے مضامین صاف کر رہا ہوں۔ امکان ہے کہ وہ بھی آئندہ شمارے کی طباعت سے قبل آپ کو مل جائیں گے۔

محشر زیدی۔ لاہور

آپ کو بہت بہت مبارک ہو کہ اب آپ الاقرباء کے مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ قاضی القضاۃ بھی ہوگئے۔ یہ منصب آپ کو آپ کے قلمکار پروفیسر خیال آفاقی نے مرحمت فرمایا ہے تاکہ آپ الاقرباء میں ''سکاٹ لینڈ یارڈ'' کا شعبہ اور اضافہ کر دیں اور اس وقت تک کسی کی شعری تخلیق کو شائع نہ کریں جب تک وہ ہر غزل کے ساتھ ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ نہ دے کہ وہ شراب نہیں پیتا۔ واقعی ایک ادبی جریدے کے فرائض میں یہ بات شامل ہونی چاہیے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ البتہ آپ چاہیں تو فتوے کیلئے آفاقی صاحب سے رجوع کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے ایک غیر مطلوبہ فتویٰ آپ کو عطا فرما بھی دیا ہے۔ اس جملے میں ''الاقرباء میں چھپنے والی شاعری کوئی قابلِ رشک نہیں ہوتی۔ وہی گھسے پٹے خیالات اور فرسودہ مضامین کوئی تنوع کوئی نیا پن نہیں'' جبکہ جملے میں استعمال ہونے والا پہلا لفظ ''کوئی'' حشوِ قبیح ہے۔ بہت غور و خوض کے بعد بھی یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ موصوف کو اس قول فیصل کے اجراء کا حق کس نے دیا کہ گھسی پٹی شاعری آپ چھاپتے ہیں۔ اب ہم الاقرباء کے گزشتہ دو شماروں سے رجوع کرتے ہیں تاکہ ہم یعنی عامتہ الشعراء کے مقابلے میں خیال آفاقی کے بلند مرتبہ اشعار پر ایک نگاہ ڈالی جا سکے۔ شمارہ جنوری تا مارچ۔ غزل پروفیسر خیال آفاقی ص ۱۱۸۔ غزل کا پانچواں شعر:

ہر دم مجھے رکھتی ہے مشیت سے خبر دار — وہ آیۂ کرسی ہو کہ ہو سورۂ رحماں

لفظ رحمان یا رحمٰن اللہ تعالیٰ کا اسم صفاتی ہے اور اسی سبب سے فرمودۂ الٰہی کو سورۂ رحمٰن کہا گیا جو اسم معرفہ ہے اور اس کا املا تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ یزداں کا قافیہ رحماں غلط ہے۔ اب رہ گئی یہ بات کہ اگر شاعر اپنے کلام کی نوک پلک درست کرنے کیلئے نظر ثانی کرے تو یہاں بھی ہاتفِ غیبی اس کی مدد پر تیار یعنی ذرا سے غور سے یہ شعر یوں ہو سکتا تھا۔

ہر دم مجھے رکھتا ہے مشیت سے خبر دار — وہ سورۂ رحمٰن میں اللہ کا فرماں

فرماں کی سند میں آتش کا یہ شعر:

کون سے دل میں نہیں یار ترے حسن کا نقش کس قلمرو میں شہِ حسن کا فرماں نہ گیا

دوسری مثال شمارہ اپریل تا جون ۲۰۰۴ء غزل ص ۹۳۔ مطلع۔

راہِ عدم میں کیسا حوالہ وجود کا دیکھا ہے ہم نے خوب تماشا وجود کا

انسانی لغات میں دو لفظ ایسے ہیں جن کی بقول سید ہجویر رحمت اللہ علیہ کوئی ضد نہیں ہے۔ پہلا لفظ 'اللہ' دوسرا لفظ عشق۔ ورنہ ہر لفظ کی ضد ہے۔ عدم کی ضد وجود ہے۔ پروردگارِ عالم نے کُن۔ فیکون (ہو جا اور ہو گیا): اس سے مراد وجود کی تخلیق ہے۔ گویا وجود پہلی چیز' پھر فرمایا۔ کل نفس ذائقة الموت. یعنی تمام موجودات کو فنا ہے۔ لہٰذا فنا یا عدم دوسرے نمبر پر ہوا۔ جب وجود ہی نہیں ہوگا تو پھر عدم کیا چیز ہوگی۔ یعنی وجود ہی کو عدم ہوتا ہے۔ تو پھر راہِ عدم میں وجود کا حوالہ کیسے نہیں ہوگا۔ کس قدر احمقانہ بات ہے اور دوسرا مصرع اس صورت میں تو درست ہے کہ آپ بذاتِ خود اللہ میاں ہیں (نعوذ باللہ) اور وجود کی مختلف شکلوں کا تماشہ کرتے رہتے ہیں ورنہ مصرع میں زم ہے بہت قوی قسم کا۔ اللہ ہم پر رحم فرمائے۔

ساتویں شعر میں ایک بلند مرتبہ شاعر کا لہجہ چرایا۔

تخلیق کائنات کے دلچسپ جرم پر ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی (عدمؔ)

آپ نے فرمایا۔

روتی تو ہوگی خون کے آنسو کبھی کبھی چشم عدم بھی دیکھ کے چہرہ وجود کا

یہ وجود عدم کا کیا لگتا ہے۔ بیٹا' بھائی' باپ یا کچھ اور رونا تو اپنے جگر گوشے یا ملکیت کیلئے ہوتا ہے روح امر ربی ہے وہ چلی گئی تو ہر شے کی نفی ہوگئی۔ شدّاد کے حوالے سے عزازیل سے اللہ میاں نے سوال کیا تھا کہ تجھے کبھی کسی پر جان نکالتے وقت رحم بھی آیا؟ چنانچہ وجود چشم عدم کی ملکیت نہیں ہے وہ کیوں روئے۔

عدم کے لغوی معنی نہیں اور نفی کے ہیں۔ چشمِ عدم یا نفی کی آنکھ خیال صاحب کے یہاں ہوتی ہوگی ورنہ یہ ترکیب ہی غلط ہے۔ نہیں سے مراد نہیں ہے وہاں چشم کا وجود مہمل بات ہے۔ گھسی پٹی کو ہزار سے ضرب دیں تو بھی چشمِ عدم اس سے سوا ہے۔

محمود کائنات اور مسجود ادلیس دو جدا شخصیتیں ہیں۔ محمودِ کائنات تو وہ ہیں جنہیں باری تعالیٰ یوم حشر میں مقامِ محمود پر متمکن فرمائے گا اور مسجود کائنات ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور ان کی توقیر کا سبب بھی

یہ ہے کہ ان کی پیشانی نورِ محمدی سے مزین تھی جو حضرت عبداللہ تک پہنچا۔ اب اگر انسان بن کے آدم Degrade ہو گئے تو نیابتِ الٰہی کا مستحق کون ہوا۔ نیابت تو اشرف المخلوقات کو دی گئی تھی۔ منہ اٹھا کے بات کہہ دینا تو جہلاء کا کام ہے سوچنا چاہیے کہ میں کیا بات کس کے لئے کہہ رہا ہوں۔ غزل کے بعض اشعار تو مہمل ہیں اور جو نہیں ہیں ان کے معنی کی ترتیب و تہذیب پر بھی غور نہیں کیا گیا جیسا کہ مقطعے میں فرمایا گیا

سمجھا دیا وجود و عدم کو خیال نے　　　آبِ رواں پہ کھینچ کے نقشہ وجود کا

خیال نے وجود و عدم کو نہیں سمجھایا وجود و عدم کا فرق سمجھایا یعنی

سمجھا رہا ہے فرق وجود و عدم خیال　　　لفظ و بیاں میں کھینچ کے نقشہ وجود کا

بلا شبہ اس عالم کون و فساد میں صرف خیال آفاقی صاحب کو ہی آتا ہے ورنہ یہ کام تو فرشتوں کے بس کا بھی نہیں۔ پرانے زمانے کے مصور ساکت پانی میں شبیہ دیکھ کر تصویر بناتے تھے جیسے علاؤ الدین خلجی نے بہانے سے مصور کو بھیج کر رانی پدمنی کی تصویر بنوائی تھی۔ رواں پانی پر تو کوئی شے اصل شکل میں رہ ہی نہیں سکتی۔

خط کی طوالت کا خوف ہے ورنہ غزل کے ایک ایک شعر کا آپریشن کیا جا سکتا تھا۔ تو آپ عاقل بھائی واقعی معیار سے گرا ہوا کلام نہ چھاپا کریں۔ خواہ وہ میرا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بات میں پھر کہوں گا کہ شعر کہنا مشکل اور شعر سمجھنا مشکل ترین عمل ہے۔ ایک چیز جسے پڑھے لکھے لوگ ''شئے لطیف'' کے نام سے جانتے ہیں وہ البتہ ہر ایک کو عطا نہیں ہوتی۔

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر (غالب)

سید مشکور حسین یاد۔ لاہور (اداریہ پر ردِ عمل)

تازہ الاقربا کا شمارہ اپریل، جون ۲۰۰۴ء کل ہی ملا ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جیسے ہی کوئی پرچہ آتا ہے قاری اپنے ذوق کی چیز پہلے پڑھتا ہے لیکن ''الاقربا'' کے اداریہ کی یہ خوبی ہے کہ سب سے پہلے جیسے ہی اس پر نظر پڑتی ہے اسے پڑھنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے -- آپ کے اداریوں کی پہلی اور بنیادی خوبی یہ ہے کہ آپ جہاں بھر پور غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں وہاں عملاً فوراً قدم بڑھانے کا مسئلہ بھی آپ کے اداریوں کے سامنے موجود ہوتا ہے۔ آپ کے اداریوں کو پڑھ کر قاری اونگھ نہیں سکتا' ان کی خوشبو اسے یعنی قاری کو سونگھنے کی دعوت دیتی ہے اور خاصے زور دار انداز میں -- اس لئے وہ چوکنا ہو جاتا ہے۔

ہاں تو آپ نے بین المملکتی ادب کی بات چھیڑی ہے اور خود اپنی تحریر میں اس کا اشارہ بھی کیا ہے کہ

اعلیٰ اور معیاری ادب بین المملکتی ہی ہوتا ہے-- جغرافیائی اثرات تو اس میں آتے ہیں اور آنے چاہئیں لیکن قدرت نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ جغرافیائی اثرات اس کے سامنے اپنی سپر ڈال دیتے ہیں۔ میرا اشارہ مشہور آیت "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" کی طرف ہے-- تو یہ احسنِ تقویم ایسی زبردست خوبی ہے جس پر علم النفس یعنی آج کی نفسیات نے ابھی تک پوری طرح توجہ نہیں دی-- آدمی کسی جگہ بھی آباد ہو پہاڑ پر یا دریا کے کنارے یا صحرا اور جنگل میں دوسرے انسانوں کے دکھ درد سے بے خبر نہیں رہ سکتا اور اگر کچھ عرصہ تک یہ بے خبری کا عالم چلتا بھی ہے تو جیسے ہی کوئی خبر ملتی ہے یہ عالم بے خبری دور ہو جاتا ہے-- آپ کا یہ مشورہ اچھا ہے کہ اگر دور نہیں تو نزدیک کے سارک ممالک میں تو لکھنے والے دانشوروں کو گھومنے پھرنے کا موقع ملنا چاہیے-- "غربت و جہالت کے بیکراں اثرات" صرف سارک ممالک کا ہی مسئلہ نہیں ہے اس وقت پوری دنیا کا مسئلہ ہے۔ دکھ بلکہ کرب کی بات تو یہی ہے کہ جو ممالک ترقی یافتہ ہیں وہاں بھی غربت و جہالت کا دور دورہ ہے لیکن ان ممالک کی غربت و جہالت دوسرے انداز کی ہے۔ یہ ممالک آسودہ حال ہونے کے باوجود ذہنی طور پر مفلوک الحال ہیں-- ان کی جہالت اس لئے ہے کہ یہ اپنی عقل کو خودغرضی کے تحت استعمال کرتے ہیں اور آپ جانتے ہیں جب ایک ذہین انسان اپنی ذہانت کا رخ خودغرضی کی طرف موڑ دیتا ہے تو پھر اس کی ذہانت مکاری عیاری کا روپ دھار لیتی ہے-- آج کل ہمارے لکھنے والے چونکہ خودغرض بھی کچھ زیادہ ہوتے جا رہے ہیں اس لئے ان کے ہاں قلم کی وہ "حزم و احتیاط" موجود نہیں ہے جس کے ضمن میں آپ نے واضح طور پر بات کی ہے-- سارک ممالک میں سیمینار اور کانفرنسیں منعقد ہوں گی لیکن اس میں وہی خودغرض اہل قلم زیادہ شامل ہونگے جو صاحبان اقتدار کی جوتیاں سیدھی کرنے کے زیادہ قائل ہیں۔ جی ہاں عملی طور پر...... اس لیے آپ نے یہ بات صدفی صد درست فرمائی ہے کہ ایک غیر ملکی مشاعرہ یا کسی نام نہاد بین الاقوامی کانفرنس کا دعوت نامہ حاصل کرنے کے لئے یہ لوگ اپنا ہی نہیں بلکہ اپنی قوم کا وقار بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں" --- غیر ملکی مشاعرہ کی بات چھوڑیئے ابھی حال ہی میں ایک "جشن بہار" کے ضمن میں لاہور میں مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے میں پاکستان کے دیگر شہروں سے بھی ایک یا دو شاعر مدعو کئے گئے تھے۔ مجھے "جشن بہار" کے مشاعرے میں بہ حیثیت سامع شریک ہونے کی دعوت کئی سال سے آ رہی تھی-- میں ہنستا تھا' یہ کیا تک ہے۔ اس دفعہ خالد لطیف صاحب مجھ سے کہنے لگے- بھئی دیکھیں تو سہی اس دعوت نامے کا کیا مطلب ہے۔ چنانچہ ہم الحمرا ہال پہنچ گئے-- اگلی نشستیں خالی تھیں ان میں سے دو پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔

ہمارے پاس ہی ظفر اقبال بھی بیٹھے ہوئے تھے۔اوپر سامنے شعرا کے لئے کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔کہ اتنے میں امجد اسلام امجد آئے اور ظفر اقبال کے کان میں کچھ کہہ کر انہیں اٹھا کر پردے کے پیچھے لے گئے۔غالباً پردے کے پیچھے خورونوش کا انتظام کیا گیا تھا-- کچھ دیر بعد یہی پردہ نشیں شعراء پردہ سے باہر آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بیٹھنے والوں میں احمد فراز' افتخار عارف، منیر نیازی' خورشید رضوی' ظفر اقبال' شہزاد احمد وغیرہم' دو تین معروف خواتین شاعرات میں سے کشور ناہید بھی تھیں' ان کے علاوہ آذر' سعود عثمانی' محسن مگھیانہ وغیرہم بھی شامل تھے۔احمد ندیم قاسمی اور منصورہ احمد کے بارے میں اعلان کیا گیا وہ آنے والے ہیں مگر وہ آئے نہیں-- امجد اسلام امجد مائک کے سامنے تشریف لائے اور اعلان کیا کہ ہم کچھ شعرا کو سامعین کے طور پر بھی بلایا کرتے ہیں تا کہ انہیں بھی کسی مشاعرہ میں ہم بلائیں-- خالد لطیف حیران ہو رہے تھے کہ یہ کیا تک ہے-- میرا خیال تھا امجد اسلام امجد میرے پاس آئیں گے اور کہیں گے بھائی مشکور آپ اوپر آ جایئے اور میں جواب دوں گا میں اب کیوں آؤں۔میرا یہ بھی خیال تھا کہ اگر امجد اسلام امجد کو خود میرا خیال نہیں آئے گا تو کوئی دوسرا شاعر انہیں کہے گا۔مگر خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔اور غالباً اس لئے نہیں ہوا کہ پڑھنے والے شعرا کو لفافے پیش کرنے تھے-- اس وقت تمام پڑھنے والے شعرا میں کوئی بھی اپنی ذات سے آگے دیکھنے والا موجود نہ تھا۔ خود غرضی آدمی کو بزدل اور بے غیرت بنا دیتی ہے-- لہٰذا میرے پیارے منصور عاقل غیر ملکی مشاعرہ کی تو بڑی بات ہے عین ملک کے اندر یہ حال ہے-- اگر آپ بھی چاہتے ہیں کہ باہر جائیں تو باہر بھیجنے والی ایجنسیوں سے ملئے' باہر بھیجنے والوں کی خوشامدیں کیجئے۔الاقرباء میں عملۂ ادارت اور مشاورت میں ان کے نام دیجئے-- دیکھئے پھر آپ کے اداریہ کا مفہوم سب کو اچھی طرح سمجھ میں آ جائے گا اور خود آپ کو بھی اسی وقت سمجھ میں آئے گا لیکن مجھے معلوم ہے آپ ایسا نہیں کریں گے۔اگر ایسا نہیں کریں گے تو پھر چیختے چلاتے رہیے شاید کسی کے کان پر کوئی جوں رینگ جائے--

آپ نے میری ایک غزل کو تفنن طبع کے لئے خوب جگہ دی ہے اور یوں یہ غزل زیادہ نمایاں ہو گئی ہے-- لیکن میری جان کیا کروں میں فارمولہ غزل کہنے سے پرہیز کر رہا ہوں اور غیر فارمولہ غزل کو آپ تفنن طبع والی غزل کہتے ہیں تو اس بار بھی ایک نہیں دو غزلیں اس طرح کی ملفوف کر رہا ہوں--- الاقربا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ اپنے اقربا میں بھی ادبی ذوق نفوذ کرانے کی سعی فرما رہے ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں-- اللہ آپ کو خوش وخرم رکھے۔آمین۔

ڈاکٹر غلام شبیر رانا۔ جھنگ

آپ جس خلوص اور محنت سے پرورش لوح و قلم میں مصروف ہیں، وہ لائق صد رشک و تحسین ہے۔ علم وادب سے آپ کی والہانہ وابستگی کا اہم ثبوت یہ ہے کہ آپ نہایت تواتر سے ''الاقربا'' شائع کر رہے ہیں۔ یہ وقیع ادبی مجلہ جو وقیع ادبی تحریروں سے مزین ہے ایک مخزن علم وادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قارئین کو اس کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔

اپریل۔جون ۲۰۰۴ء کے مجلے میں آپ کا اداریہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ شمارہ حسب معمول افکار تازہ سے مزین ہے۔ تخلیق کاروں نے اسے دھنک رنگوں کا حسین منظر نامہ بنادیا ہے۔ میں سپاس گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس رجحان ساز ادبی مجلے سے مستفید ہونے کا موقع عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔

جعفر بلوچ

میں بہت طویل عرصے سے آپ کا ''الاقرباء'' دیکھتا آرہا ہوں اور بارہا آپ سے رابطہ کرنے کا خیال بھی آیا لیکن تساہل حائل رہا۔ اب آپ کا تازہ شمارہ ایک دوست کی وساطت سے ملا تو میں نے سوچا کہ آپ سے ہم کلامی کی سعادت حاصل ہو ہی جائے۔ اپنی دو کتابیں بھی آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ حضرت اسد ملتانی کے نام سے تو آپ یقیناً آگاہ ہوں گے۔ ملاقات کا موقع معلوم نہیں آپ کو ملا کہ نہیں۔ میں خود بھی ان سے نہیں مل سکا تھا۔ ملتا بھی کیسے؟ ان کی وفات کے وقت میں صرف بارہ سال کا تھا اور لیہ میں چھٹی جماعت میں زیر تعلیم تھا۔ خیر! البتہ کشفی ملتانی مرحوم سے شرف نیاز حاصل کرنے کا مجھے بہت موقع ملا۔ ان کے بارے میں میرے دو مضمون بھی برادر مکرم ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب کی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہیں۔ کچھ اور بھی لکھنے کا ارادہ ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

دو غزلیں بھیج رہا ہوں۔ امید آپ انہیں مدیرانہ حسن سلوک کا مستحق سمجھیں گے۔ پروفیسر ڈاکٹر توصیف تبسم سے ملاقات ہو تو انہیں میرا سلام پہنچا دیں۔

بابر نسیم آسی۔ لاہور (بحوالہ برصغیر پاک و ہند میں حافظ شناسی)

سہ ماہی ''الاقرباء'' کا شمارہ بابت جنوری۔مارچ ۲۰۰۴ نظر سے گزرا۔ اس شمارے (جلد نمبر ۷ شمارہ

نمبرا) کے حوالے سے اس میں شامل سید مرتضٰی موسوی کے مضمون ''برصغیر پاکستان و ہند میں حافظ شناسی'' نے آپ سے مخاطب ہونے پر مجبور کیا ہے۔ لہٰذا میرے عریضہ کے مندرجات اسی تناظر میں ملاحظہ فرمائے جائیں۔ مذکورہ بالا مضمون میں حافظ شیرازی کا ایک شعر صفحہ ۳۰ کے آغاز پر موجود ہے:

وقت راغنیمت داں آن قدر کہ بتوانی　　حاصل از حیات ای جاں یکدم است تا دانی

اس شعر کے ضمن میں ادارہ کی طرف سے حاشیہ میں یہ نوٹ دیا گیا ہے:

''حافظ کے اس شعر میں ''قدر'' متحرک استعمال ہوا ہے جیسا کہ قضا و قدر جبکہ بہ اعتبار معنی ساکن ہونا چاہیے (قدر بہ معنی مقدار) کیا ہمارے فاضل قارئین میں سے کوئی صاحب ہماری رہنمائی فرمائیں گے؟ (ادارہ)''۔

راقم کو فاضل ہونے کا دعویٰ تو ہرگز نہیں تاہم ایک طالب علم کی حیثیت سے اس ضمن میں چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

اولاً یہ کہ زیر بحث شعر کے مصراع ثانی کا متن چھوٹی سی تصحیح کا متقاضی ہے یعنی بجائے ''یکدم'' ''ایندم'' ہونا چاہیے جو موضوع کے اعتبار سے موزوں تر ہے کیونکہ شاعر ہر لمحے کی نہیں بلکہ لمحۂ موجود کی اہمیت واضح کر رہا ہے اور یہ مطلب ''این دم'' سے زیادہ واضح ہوتا ہے۔ میری نظر میں جہاں تک ادارہ کے ''دال ساکن'' اور ''دال مفتوح'' پر مفہوم و اوزان کے حوالہ سے اعتراض کا تعلق ہے وہ درست قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ قدر (دال ساکن) اور قدر (دال مفتوح) دونوں کا مادہ ایک ہے یعنی (ق در) اس لیے دونوں کے معانی میں بھی اشتراک پایا جاتا ہے۔ اندازہ، حد، تقدیر، حکم دونوں کے مشترک معانی ہیں۔ فارسی میں قضا و قدر کی طرح این قدر، آن قدر اور چہ قدر میں آنے والا قدر بھی متحرک ہوتا ہے۔ چنانچہ حافظ نے اس شعر میں ''آن قدر'' (دال متحرک) ہی استعمال کیا ہے۔ اسی غزل کا پانچواں شعر اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔

محتسب نمی داند این قدر کہ صوفی را　　جنس خانگی باشد ہمچو لعل رمانی

حافظ کے ایک اور مشہور شعر میں بھی قدر (با دال مفتوح) استعمال ہوا ہے

جز این قدر نتواں گفت در جمال تو عیب　　کہ خال مہر و وفا نیست روی زیبارا

تلاش کرنے سے ایسی اور مثالیں بھی مل جائیں گی۔ حافظ کے لیے ایک لحہ کو بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اوزان شعر سے ناواقف تھے یا انہیں عربی پر دسترس حاصل نہیں تھی اور حافظ ہی پر موقوف نہیں۔ فارسی

کے بڑے بڑے شعراء نے بھی ''قدر'' (با دال مفتوح) اس مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اس ضمن میں بخوف طوالت صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ اوپر حافظ کا جو آخری شعر درج ہوا ہے' اس کا پہلا مصرع دراصل شیخ سعدیؒ کا ہے اور حافظ نے اسے قریب قریب جوں کا توں اپنا لیا ہے۔ سعدیؒ کہتے ہیں۔

جز این قدر نتوان گفت بر جمال تو عیب　　　که مهربانی ازآن طبع و خونمی آید

اس میں شک نہیں کہ حافظ کا دوسرا مصرع سعدی کے مقابلے میں بہت بلند ہے لیکن یہاں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ''قدر'' کے تلفظ اور مفہوم کے معاملے میں دونوں اساتذہ متفق ہیں۔

دوسری بات یہ کہ سید مرتضیٰ موسوی کا مضمون ''برصغیر پاکستان و ہند میں حافظ شناسی'' پڑھ کر گمان ہوا کہ یہ مضمون پہلے بھی کہیں نظر سے گزرا ہے لیکن پورے مضمون میں کہیں بھی ترجمہ کے حوالے سے کوئی بات نہ مل سکی۔ شاید فاضل مصنف اس کا تذکرہ کرنا بھول گئے ہیں۔ تلاش بسیار کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ اس سے پہلے یہی مضمون فارسی زبان وادب کے ماہر معروف دانشور اور محقق سید عارف نوشاہیؒ کے نام سے مجلّہ ''دانش'' شمارہ ۱۵' پاییز ۱۳۶۷ میں شائع ہو چکا ہے۔ حوالے کے لئے دیکھیے مجلّہ دانش شمارہ مذکورہ از ص ۴۵ تا ص ۸۰ بعنوان ''نخستین شرح فارسی دیوان حافظ در شبہ قارہ''۔ اور ''ورود و شیوع شعر حافظ در شبہ قارہ'' کے ذیلی عنوان کے تحت اس مضمون میں موجود تفصیلات وہیں سے مستعار لی گئی ہیں۔

سید مرتضیٰ موسوی نے مضمون کے آغاز میں ہی دیوان حافظ کے مؤلف محمد گل اندام کے حوالے سے حافظ کی زندگی میں ہی ان کے کلام کی آفاقی شہرت کا تذکرہ کیا ہے تاہم اس کا حوالہ نہیں دیا جبکہ حوالے کے بغیر کسی بھی تاریخی روایت کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر عارف نوشاہی کے مضمون میں یہی روایت ص ۵۲ س ۱۰ پر حوالہ کے ساتھ موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''پس در حدود چہل سالگی حافظ شہرتش بہ ہند رسیدہ بود چنانکہ محمد گلندام معاشر و معاصر حافظ نیز در مقدمۂ دیوان حافظ می نویسد کہ: روا حل غزلہای جہانگیرش در ادنیٰ مدتی باقصای ترکستان و ہندوستان رسیدہ''۔

اس کے فوراً بعد بیان ہونے والی سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی روایت کا ''لطایف اشرفی'' کے حوالے سے ذکر تو ہوا ہے لیکن منابع و ماخذ میں اس کی تفصیل موجود نہیں کہ اس کا مقام طباعت اور سال اشاعت کون سا ہے جبکہ ڈاکٹر عارف نوشاہی کے مضمون میں یہی روایت ص ۴۵ س ۵ پر حوالے کے ساتھ موجود ہے۔ سید عارف نوشاہی نے تحقیق کی روایت کے مطابق دیانت داری سے کام لیتے ہوئے ''حیات سید اشرف

جہانگیر سمنانی" از سید وحید اشرف'' کا حوالہ دیا ہے۔ تحقیق کے اصولوں میں یہ واضح اور روشن ہے کہ محقق اگر کسی وجہ سے اصل کتاب نہ دیکھ پائے تو اس کا دیانت داری سے ذکر کرے ورنہ کسی کتاب سے کوئی حوالہ بعینہٖ نقل کر دینے سے وہ سلسلہ چل نکلے گا جس سے تحقیق کی روایت مجروح ہوگی۔

اس مضمون میں ملفوظات سمنانی کے مؤلف نظام یمنی کی طرف سے حافظ اور حضرت سمنانیؒ کی ملاقات کی تصدیق کا حواشی میں معتبر حوالہ موجود نہیں ہے جبکہ یہی روایت عارف صاحب کے مضمون میں ص ۴۶س ۲۰ پر حوالے کے ساتھ موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''نظام یمنی گردآورندۂ ملفوظات سمنانی نیز در بارۂ ملاقات سمنانیؒ با حافظ سخن گفتہ است۔ آنجا کہ می گوید: شمس الدین محمد حافظ را بحضرت قدوۃ الکبریٰ (یعنی سمنانیؒ) مصاحبت واقع شدہ بسیار بسیار پسندیدند۔ چنانکہ باین معنی در چند جای اشعار رفتہ است۔''

اس کے فوراً بعد محمد قاسم ہندوشاہ استر آبادی کے حوالے سے یہی بات بعینہٖ ص ۴۷س ۱۰ پر موجود ہے۔ حوالہ کے لئے دیکھیے:

''محمد قاسم ھندوشاہ استر آبادی معروف بہ فرشتہ در تاریخ فرشتہ (تالیف بسال ۱۰۱۵ھ) غزلی نقل کردہ کہ حافظ برای وزیر سلطان محمود شاہ بہمنی پادشاہ دکن (حکومت: ۷۸۰۔۷۹۹ق) فرستادہ بود۔

مطلع غزل انیست:

دمی با غم بسر بردن جہان یکسر نمی ارزد   بمی بفروش دلق ما کزین بہتر نمی ارزد

اس کے بعد حافظ کی حاکم بنگال کو ارسال کی جانے والی غزل۔

''ساقی حدیث سرو وگل و لالہ می رود''

انہی بیان کردہ تین اشعار اور ان کے ساتھ دی گئی تفصیلات کے ساتھ بعینہٖ مجلّہ ''دانش'' کے صفحہ ۴۷ س ۷ اپر ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے۔

''ریاض السلاطین'' کے مؤلف غلام حسین زید پوری کے حوالے سے حافظ اور سلطان غیاث کے ہم عصر ہونے کے بارے میں روایت بیان کی ہے لیکن موسوی صاحب اس کا حواشی میں ذکر نہیں کر سکے جبکہ یہی روایت عارف نوشاہی کے مضمون میں از ص ۴۹س ۲۱ تا ص ۵۰ بعینہٖ فارسی الفاظ میں ملتی ہے۔ حوالے کے لئے ملاحظہ فرمائیے مجلّہ ''دانش'' شمارہ ۱۵ از ص ۴۹' س ۲۱ تا ص ۵۰' س ۱۱۔

مؤلف ''مرج البحرین'' کے حوالے سے حافظ کے کلام کی ترویج و اشاعت کا فاضل مصنف حوالہ پیش نہیں کر سکے جبکہ عارف صاحب کا مذکورہ بالا مضمون اسی ''مرج البحرین'' کے حوالے سے ہے جو برصغیر پاک و ہند میں دیوان حافظ کی پہلی فارسی شرح ہے۔ ان کے مضمون میں یہی حوالہ ص ۵۳ س ۶ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ کسی مستند حوالے کے بغیر کسی بھی تاریخی واقعہ یا روایت کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

سید مرتضٰی موسوی کے مضمون میں شہزادہ دارالشکوہ کی دیوانِ حافظ سے فال نکالنے کی روایت کا حوالہ ''سفینۃ الاولیاء'' سے بھی پیش نہیں کر سکے جبکہ عارف صاحب کے مضمون میں یہی روایت ص ۵۳ س ۱۶ پر حوالے کے ساتھ موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''شاہزادہ داراشکوہ فرزند شاہجہان در ''سفینۃ الاولیاء'' می نویسد: اکثر تفاولی کہ از دیوان حقیقت بیان ایشان (یعنی حافظ) نمودہ می شود موافق مطلب بر می آید۔ چنانچہ جہانگیر پادشاہ کہ در ایام شہزادگی بہ سبب آزردگی از والد خود جدا شدہ در الہ آبادی بودند و تردد داشتند در اینکہ بملازمت پدر عالی قدر بروند یا نہ؟ دیوان حافظ را طلب نمودہ فال کشادند این غزل برآمدہ:

چرا نہ در پی عزم دیار خود باشم　　　چرا نہ خاک رہ کوی یار خود باشم

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر عارف نوشاہی کا مذکورہ مضمون برصغیر میں دیوان حافظ کی پہلی فارسی شرح ''مرج البحرین'' کے حوالے سے ہے۔ سید مرتضٰی موسوی کے بیان کردہ پیراگراف ''برصغیر میں دیوان حافظ کی شرح نگاری'' کو عارف نوشاہی کے مضمون میں ص ۵۵ س ۱۱ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

ختمی لاہوری کے شرح لکھنے کے مقصد کو ''مرج البحرین'' کے حوالہ سے ثابت کیا جانا چاہیے تھا لیکن فاضل مصنف اس کا حوالہ پیش نہیں کر سکے جو اس بات کی غماز ہے کہ شاید یہ شرح ان کی نظر سے نہ گزری ہو لیکن عارف نوشاہی کے مذکورہ مضمون میں یہ بات حوالے کے ساتھ ص ۶۰ اور ۶۱ پر موجود ہے۔

سید مرتضٰی موسوی کے بقول ''مرج البحرین'' کے مؤلف ختمی لاہوری نے اس کتاب کے ۵۴ مآخذ بیان کئے ہیں۔ ڈاکٹر عارف نوشاہی کے مضمون میں یہ مآخذ تفصیل سے ص ۶۲ تا ص ۶۵ ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ دیوانِ حافظ پر لکھی جانے والی شرحوں میں مولانا عبداللہ خویشگی قصوری کی چار شرحوں کا تذکرہ کیا ہے۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ چوتھی شرح کا حواشی کے اعتبار سے حوالہ نمبر ۴ لکھا ہے۔ (ملاحظہ

فرمائیے: الاقرباء جلد ۷ شمارہ ۱ ص ۲۵ س ۱۲) جبکہ اس کا حواشی یا منابع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ حوالہ عارف صاحب کے مذکورہ مضمون میں بعینہٖ موجود ہے جو پہلی مرتبہ ایران میں زیور طبع سے آراستہ ہوا تھا۔ شاید فاضل مصنف جلدی میں یہ حوالہ اسی طرح درج کر گئے۔ عبداللہ خویشگی کی ان شرحوں کی تفصیل مجلہ ''دانش'' کے شمارے میں ص ۵۵ س ۱۸ تا ص ۵۶ س ۶ ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح محمد بن یحییٰ کی دیوان حافظ پر شرح اور شاہ بہلول کول برکی جالندھری کی دو شرحیں بغیر حوالے کے موجود ہیں جبکہ ڈاکٹر عارف نوشاہی کے مضمون میں یہی تفصیلات حواشی کے ساتھ ص ۵۶ س ۶ تا س ۹ ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ فاضل مضمون نگار مظفر حسین کی شرح کا زمانہ تالیف مشخص نہیں کر سکے۔ (دیکھیئے: الاقرباء ص ۲۵ س ۲۱) جبکہ عارف نوشاہی نے بھی اپنے مذکورہ مضمون میں لکھا ہے کہ اس کا سال تالیف شناخت نہیں ہو سکا۔ ثبوت کے لئے دیکھئے مجلہ ''دانش'' شمارہ ۱۵، ص ۵۶ س ۱۰۔

اسی طرح سید مرتضیٰ موسوی کے مذکورہ مضمون میں ذیلی عنوان ''برصغیر میں دیوان حافظ کے قدیم ترین خطی نسخے'' میں بیان کردہ تفصیلات ڈاکٹر عارف نوشاہی کے مضمون میں ص ۵۴ س ۵ تا س ۱۰، ص ۵۵ س ۲ تا س ۸ ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

''الاقرباء'' کے اسی شمارے میں صفحہ ۲۱ پر مقالہ نگاروں اور شاعروں سے بھی ادارہ نے التماس کی ہے کہ:

''سہ ماہی الاقرباء میں چونکہ ایسے غیر مطبوعہ مضامین نظم و نثر کی اشاعت ہمارا مدعا ہے جو تخلیقی یا تحقیقی ہوں اس لئے اس ضمن میں آپ کے گراں بہا تعاون کے لیے ادارہ آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوگا''۔

آپ کا ارادہ سو فیصد اخلاص پر مبنی ہے اور خوش آئند بھی ہے۔ لیکن اس کی تکمیل اسی صورت میں ممکن ہے کہ جو مقالات و مضامین آپ شامل اشاعت کریں انہیں مقالہ نگاروں کی صوابدید پر ہی نہ چھوڑ دیں بلکہ مدیر کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ یقین کرلے کہ یہ مضمون اس سے پہلے کہیں شائع تو نہیں ہو چکا اور اس کا مناسب حل کیا ہے؟ ☆

فاضل قلم کاروں سے بھی اپیل ہے کہ اگر کوئی مضمون ہمیں پسند آتا ہے تو بجائے اس کے کہ ہم اس

☆ ادارہ کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ اپنے علم و خبر کے مطابق صرف غیر مطبوعہ مواد ہی شریک اشاعت کیا جائے لیکن اس سلسلہ میں صد فی صد یقین کیونکہ عملاً ممکن نہیں۔ اس لئے محترم صاحبانِ تصنیف و تالیف ہی کے اخلاقی احساسِ ذمہ داری پر انحصار کیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

میں معمولی ردو بدل کر کے اسے اپنے نام سے چھپوائیں اس کو ترجمے کے خوبصورت قالب میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ یوں بھی تحقیق کا کوئی حرف 'حرف آخر نہیں ہوتا اور اس راستے کو مزید کھنگالا جاسکتا ہے۔

آخر میں صرف ایک بات کہ اسی شمارے میں صفحہ ۲۱ پر ''تعاون کے لیے التماس'' کے زیر عنوان آپ نے قلمی معاونین سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنی نگارشات ٹائپ شدہ یا قدرے احتیاط سے تحریر کر کے بھیجیں تاکہ پڑھنے میں دشواری نہ ہو کیونکہ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ''الاقرباء'' کے مندرجات اغلاط سے پاک ہوں''۔ اب نامعلوم کہ یہ مضمون کس صورت میں آپ کو ملا ہوگا۔ ٹائپ شدہ یا خوش خط لکھ کر یا اس طرح کہ صاف نہ پڑھا گیا ہو کیونکہ اس مضمون میں متعدد اغلاط سامنے آئیں۔

ڈاکٹر عبدالحق خاں حسرت کاسگنجوی۔ حیدرآباد

آپ کا رسالہ الاقرباء نظر سے گذرا۔ اچھا لگا۔ مضامین اور مقالات کا حصہ خاصا وزنی ہے۔ علمی ادبی دنیا میں یہ ایک اضافہ ہے۔ افسانوی حصہ بے حد مختصر ہے لیکن تینوں کہانیاں اچھی ہیں۔ کتابوں پہ تبصرے نہایت متوازن اور سلیقے سے کیے گئے ہیں' آپ کو اس گراں قدر علمی تحقیقی شمارے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اگر ممکن ہو سکے تو افسانوی حصے کو کچھ اور وسعت دیجیے۔

پرتو روہیلہ کا نیا شعری مجموعہ

''اک دیا دریچے میں''

دلگداز شاعری اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ

فیروز سنز لمیٹڈ لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔

قیمت 180 روپے

خبرنامہ

الاقرباء فاؤنڈیشن

(اراکین کیلئے)

مرتبہ

شہلا احمد

احوال وکوائف

☆ صدر الاقرباء فاؤنڈیشن کا بیرونِ ملک دورہ

صدر الاقرباء جناب سید منصور عاقل اور آپ کی اہلیہ بیگم ناہید منصور صاحبہ گذشتہ دنوں اپنے نواسے دانیال تجمل ہاشمی کی ولادت کے موقع پر انگلینڈ تشریف لے گئے تھے اب وطن واپس آ گئے ہیں۔ آپ کا یہ دورہ ماشاء اللہ ہر لحاظ سے نہایت مبارک' خوشگوار اور دلچسپ رہا۔ آپ نے زیادہ تر وقت اپنی صاحبزادی ڈاکٹر صباحت صمد ہاشمی' داماد عزیزی ڈاکٹر صمد تجمل ہاشمی اور ننھے منے نواسے دانیال میاں کے درمیان خوشیوں اور مسرتوں کے ساتھ گذارا لیکن وہاں رہائش پذیر دوسرے عزیز واقارب اور احباب سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ علمی وادبی محافل میں شرکت کی' اہل ذوق حضرات نے جناب صدر کے اعزاز میں کئی تقاریب اور پروگراموں کا اہتمام کیا۔ جن میں سب سے اہم اور دلچسپ آپ کا وہ ایک گھنٹہ دورانیہ کا انٹرویو تھا جو لندن کے ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل Vectone نے براہ راست ٹیلی کاسٹ کیا۔ اس کی میزبانی مسز ہما پرائس نے کی۔ یہ پروگرام امریکہ' یورپ' پاکستان' انڈیا میں دیکھا گیا۔ ناظرین نے پروگرام کے حوالے سے آپ سے بہت سے سوالات کئے جن کے جوابات آپ نے نہایت خوبصورتی اور جامعیت سے دیئے۔ جس کو ناظرین نے بہت پسند کیا۔ الاقرباء فاؤنڈیشن کے حوالے سے گفتگو اور سہ ماہی الاقرباء پر تبصرہ خصوصاً سب کی دلچسپی کا باعث بنا رہا۔ ایک اور تقریب ''بیاد حسرت موہانی'' کے عنوان سے منعقد ہوئی۔ اس کا اہتمام جناح سوسائٹی لندن اور پاکستان پروفیشنلز انٹرنیشنل نے کیا تھا۔ میزبانی کے فرائض جناح سوسائٹی کے صدر جناب بیرسٹر سلیم قریشی نے انجام دیئے' جبکہ صدارت کا شرف جناب سید منصور عاقل کو حاصل ہوا۔ پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر جناب مراد علی اس محفل کے مہمان خصوصی تھے۔ تقریب کے بعد ڈنر کا اہتمام تھا۔ ڈنر کے بعد محفل مشاعرہ کا انعقاد ہوا' جس کی صدارت بھی جناب عاقل ہی کو سونپی گئی۔

آپ کے قیام کے دوران لندن سے شائع ہونے والے اخبار ''پاکستان پوسٹ'' نے بھی آپ کی برطانیہ میں موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک خصوصی انٹرویو کیا۔ جس کی تکمیل جناب فیضان عارف نے

کی۔ اُردو ادب کے حوالے سے یہ ایک نہایت اہم، معلومات افزاء اور فکر انگیز انٹرویو تھا۔ جو موضوع پر جناب صدر کی مکمل گرفت کی عکاسی کرتا تھا اور ساتھ ہی اس امر کی نشاندہی بھی کہ صدر محترم بیرونِ ملک علمی و ادبی حلقوں میں بھی بڑی شہرت وقدر و منزلت رکھتے ہیں۔

☆ سہ ماہی الاقرباء کی بیرون ملک شہرت ومقبولیت

ادارہ سہ ماہی الاقرباء نہایت فخر و انبساط سے یہ خبر رقم کر رہا ہے کہ "سہ ماہی الاقرباء" کی شہرت و مقبولیت کا گراف ماشاءاللہ روز بروز بلند سے بلندتر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا شمار ملک کے صفحہ اول کے علمی و ادبی جرائد میں ہوتا ہی تھا اب اس کی مقبولیت بیرون ملک بھی بام عروج پر پہونچ گئی ہے اور صدر الاقرباء فاؤنڈیشن جناب منصور عاقل کے لندن سے ٹی وی انٹرویو کے بعد سے تو اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ انگلینڈ کے اُردو ادب سے لگاؤ رکھنے والے ادبی حلقوں نے تو اس کو اتنا پسند کیا کہ انہوں نے وہاں کی لائبریریوں کیلئے اس کی ترسیل کی پرزور فرمائش کی۔ اس کے علاوہ ان اہل ذوق حضرات وخواتین نے بھی جو بہترین اُردو ادب پڑھنا چاہتے ہیں، اس مجلہ کی انفرادیت وافادیت کو بڑا سراہا۔ اور ہر قیمت پر اسے حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ ایک خاتون نے تو پیشگی چیک لکھ کر بھجوا دیا۔ بڑا حوصلہ ہوتا ہے یہ سب دیکھ کر۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس سہ ماہی کو مزید خوبصورت، معلومات افزاء اور تمام قارئین کیلئے مفید و موثر بنائے۔ آمین

☆ بیرونِ ملک روانگی وواپسی

مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن کے رکن محترم سید آفتاب احمد اپنی اہلیہ محترمہ طیبہ آفتاب کے ہمراہ گزشتہ دنوں دوبئی تشریف لے گئے تھے۔ وہاں وہ اپنے صاحبزادے اور بہو کے پاس دو ماہ سے زیادہ قیام کر کے واپس تشریف لے آئے ہیں۔

☆ جناب منصور عاقل کو صدمہ

انتہائی دکھ اور افسوس کے ساتھ یہ خبر رقم کی جاتی ہے کہ صدر الاقرباء فاؤنڈیشن محترم سید منصور عاقل صاحب کی بڑی ہمشیرہ (بیگم الطاف رشید مرحوم) محترمہ شاہ زمانی بیگم ۱۵۔ اپریل ۲۰۰۴ء کو قضائے الٰہی سے وفات پا گئیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ آپ جناب جمشید فرشوری (کنٹرولر پاکستان ٹیلی وژن) کی خوشدامن اور بیگم ناہید فرشوری کی والدہ محترمہ تھیں۔ آپ کچھ عرصہ سے علیل تھیں۔ پسماندگان میں آپ کی

ایک صاحبزادی اور دو صاحبزادے شامل ہیں۔ ادارہ اس سانحہ رحلت پر جناب صدر اور تمام اہل خانہ مرحومہ کی صاحبزادی اور صاحبزادوں اور دیگر عزیز و اقارب کے غم میں برابر کا شریک ہے اور مرحومہ کے بلند درجات اور جوار رحمت میں جگہ کیلئے دعا گو ہے۔۔اللہ تعالیٰ پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

☆ جناب محمود اختر سعید کی انگلینڈ روانگی

سہ ماہی الاقرباء کے مدیر جناب محمود اختر سعید گذشتہ ماہ انگلینڈ کے دورے پر تشریف لے گئے ہیں۔وہاں آپ کا قیام اپنے صاحبزادے اور دیگر عزیز و اقارب کے یہاں رہے گا۔ادارہ دعا گو ہے کہ آپ کا یہ دورہ ہر لحاظ سے آپ کیلئے مبارک و خوشگوار اور خوشیوں اور مسرتوں کا پیامبر ہو۔آمین ثمہ آمین

☆ ولادتِ باسعادت

الاقرباء فاؤنڈیشن کے صدر محترم سید منصور عاقل کے فرزند جناب سید سلمان منصور کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور پیاری سی بیٹی عطا فرمائی ہے۔ولادت مورخہ ۹۔اپریل ۲۰۰۴ء بروز جمعتہ المبارک ہوئی۔ بچی کا نام سیدہ علینہ تملیذ رکھا گیا ہے۔اس پر مسرت موقع پر ادارہ جناب و بیگم سید منصور عاقل' عزیزی سلمان و عزیزہ سارہ اور دیگر اہل خاندان کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے اور دختر کی خوش بختی و درازی عمر کیلئے دعا گو ہے۔مزید خوشی کی بات یہ ہے کہ نومولودہ الاقرباء فاؤنڈیشن کی تاحیات رکن بن چکی ہیں۔

☆ ولادت فرزند پر مبارکباد

الاقرباء فاؤنڈیشن کے رکن جناب سید منسوب علی زیدی و بیگم فیروزہ زیدی صاحبہ کے فرزند ارجمند عزیزی سید مشرف علی زیدی کو اللہ تعالیٰ نے دولت فرزند سے نوازا ہے۔نومولود کی پیدائش ۱۲۔مئی بمطابق ۲۲ ربیع الاول ۲۰۰۴ء بروز بدھ امریکہ میں ہوئی۔ان کا نام سید موسیٰ علی زیدی رکھا گیا ہے۔ادارہ اس مبارک و پرمسرت موقع پر جناب و بیگم منسوب علی زیدی' عزیزی مشرف و عزیزہ جویریہ زیدی اور دیگر اہل خانہ کو دلی تہنیت پیش کرتے ہوئے فرزند کی نیک بختی و درازی عمر کی دعا کرتا ہے۔

☆ تعلیمی شعبے میں بہترین کارکردگی

رکن مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن جناب سید مزمل اللہ سالاری اور ڈپٹی سیکرٹری محترمہ ہما سالاری کی دختران نیک اختر عزیزہ وجیہا سالاری اور ملیحہ سالاری حسب سابق اس مرتبہ بھی اپنی کلاس میں

بہترین کارکردگی کی حامل رہیں۔ وجیہا سالاری نے کلاس 5th میں ۹۶٫۵ فیصد نمبر حاصل کئے اور فرسٹ پوزیشن لی جبکہ ملیحہ سالاری نے کلاس 1st میں ۹۷ فیصد نمبر لئے اور فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ دونوں بچیاں Presentation Convent High School Rawalpindi کی ہونہار طالبات ہیں۔ ادارہ اس پُرمسرت موقع پر جناب و بیگم سالاری عزیزہ وجیہا و ملیحہ سالاری اور تمام اہل خانہ کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہے کہ مستقبل میں بھی ایسی بے شمار کامیابیاں بچیوں کے قدم چومیں۔ آمین

☆ سالانہ امتحانات میں نمایاں کامیابی

رکنِ مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن جناب ایس ایم حسن زیدی و بیگم شہلا حسن زیدی کے فرزند فائز حسن زیدی جو بیکن ہاؤس اسکول کے ہونہار طالب علم ہیں۔ ماشاءاللہ کلاس ششم میں ۸۱ فیصد نمبر حاصل کر کے کامیاب ہو گئے ہیں اور اب کلاس ہفتم میں پہونچ گئے ہیں۔ دوسری طرف آپ کی صاحبزادی سبل حسن نے ۷۵ فیصد نمبر حاصل کر کے کلاس سوئم پاس کر لی ہے اور کلاس چہارم میں آ گئی ہیں۔ ادارہ اس کامیابی پر دونوں بچوں اور جناب حسن زیدی و بیگم شہلا زیدی کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔۔ اللہ تعالیٰ مستقبل میں ان بچوں کو تمام شعبہ ہائے زندگی میں شاندار کامیابیاں اور کامرانیاں عطا فرمائے۔ آمین

☆ جناب ایس ایم حسن زیدی کی نئی تقرری

جناب ایس ایم حسن زیدی رکن مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن کا تقرر مورخہ ۱۶۔ اپریل ۲۰۰۴ء سے پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ ڈویژن اسلام آباد میں کر دیا گیا ہے یہاں بھی آپ بدستور جوائنٹ سیکرٹری کی حیثیت میں فرائض منصبی ادا کرتے رہیں گے۔ قبل ازیں آپ وزارت صنعت و پیداوار میں اسی عہدہ پر فائز تھے۔

☆ ممبرانِ مجلسِ عمومی کی یاددہانی کیلئے

آج ایک بار پھر آپ کی توجہ اس طرف دلائی جا رہی ہے کہ براہ مہربانی اپنے اہل خانہ اور دیگر خاندان کی اہم خبریں مثلاً شادی بیاہ، ولادت، امتحانات میں کامیابی، حج و عمرہ کی سعادت اور اسی طرح کی دوسری اہم اطلاعات ہمیں پیشگی بھیجنا یاد رکھا کیجئے کہ آپ کی خبریں آپ کے اپنے "سہ ماہی الاقرباء" میں شائع کر کے ہمیں خوشی ہوتی ہے۔۔ ہمارا پتہ ایک بار پھر نوٹ فرما لیجئے۔

سہ ماہی الاقرباء۔ مکان نمبر ۶۴ سٹریٹ ۵۸ سیکٹر ۸/۳۔ آئی، اسلام آباد

☆ تعلیمی شعبہ میں اعلیٰ کارکردگی ۔ ایک اور خبر

جناب سید منور عالم ممبر الاقرباء فاؤنڈیشن و بیگم رفعت عالم کی ہونہار صاحبزادیوں نے اپنے سالانہ امتحانات نہایت شاندار طریقہ سے پاس کرلئے ہیں۔ سیدہ شبیہ فاطمہ نے کلاس چہارم میں ۷۰۰ میں سے ۶۵۹ (۹۵ فیصد) نمبر حاصل کرکے فرسٹ پوزیشن لی ہے۔ عروسہ فاطمہ نے کلاس سوئم میں ۷۰۰ میں سے ۶۷۶ (۹۷ فیصد) نمبر حاصل کرکے سیکنڈ پوزیشن حاصل کی ہے جبکہ سب سے چھوٹی صاحبزادی ماہ نور فاطمہ Pre Nursury میں فرسٹ پوزیشن حاصل کرکے کامیاب ہوگئی ہیں۔ یہ تینوں بچیاں Amaranlh Secondary School Afshan Colony, Rawalpindi Cantt کی طالبات ہیں۔

ادارہ اس پر مسرت موقع پر جناب منور عالم و بیگم رفعت صاحبہ عزیزہ شبیہ فاطمہ، عروسہ فاطمہ، ماہ نور اور دیگر اہل خانہ کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے بچیوں کی مزید شاندار کامیابیوں کیلئے دعا گو ہے۔۔۔!!

☆ یورپ وامریکہ میں سہ ماہی الاقرباء کے معاونین خصوصی

قارئین کیلئے یہ خبر نہایت مسرت و دلچسپی کا باعث ہوگی کہ معروف قانون داں، مقبول علمی و ادبی شخصیت اور جناح سوسائٹی لندن کے صدر بیرسٹر سلیم قریشی صاحب نے جو برطانیہ میں گزشتہ چالیس برس سے سکونت پذیر ہیں صدر الاقرباء جناب منصور عاقل کی ذاتی درخواست پر یورپ کیلئے سہ ماہی الاقرباء کا معاون خصوصی بننا قبول کرلیا ہے۔ آپ اپنی حالیہ تصنیف کے سبب جو بانیء پاکستان حضرت قائداعظمؒ کی سوانح پر ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اور جسے چند برس قبل آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا، نہ صرف بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں بلکہ برطانیہ کے مقتدر و وقیع قانونی حلقوں میں نہایت احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

اسی طرح امریکہ میں طویل مدت سے مقیم ممتاز اہل قلم سید محمد اویس جعفری نے بھی صدر الاقرباء فاؤنڈیشن کی درخواست پر امریکہ میں سہ ماہی الاقرباء کے لئے خصوصی معاون کے طور پر فرائض انجام دینے کے لئے اظہار رضامندی فرمایا ہے۔ آپ سیٹیل (واشنگٹن) میں سکونت رکھتے ہیں اور ایک خوش فکر اور بدیہہ گو شاعر کی حیثیت سے امریکہ میں منعقد ہونے والی اکثر ادبی و شعری محفلوں کے روح و رواح سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ سہ ماہی الاقرباء کے جملہ امور سے متعلق یورپ و امریکہ میں اُردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے خواتین و حضرات ہمارے معاونین سے رابطہ کرسکتے ہیں اور سہ ماہی الاقرباء کی ترسیل کے سلسلہ میں بھی انہیں سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

☆ جناب اختر وحید کی بریگیڈیئر کے عہدہ پر ترقی

جناب اختر وحید جو محترم سید آفتاب احمد رکن مجلسِ انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن و بیگم طیبہ آفتاب صاحبہ کے داماد ہیں' ماشاء اللہ فل کرنل کے عہدہ سے ترقی پا کر بریگیڈیئر ہو گئے ہیں۔ آج کل وہ AMC سیالکوٹ میں تعینات ہیں اور بریگیڈیئر کے نئے منصب کے حوالے سے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ ادارہ سہ ماہی الاقرباء اور ممبرانِ فاؤنڈیشن اس پر مسرت موقع پر تمام اہل خاندان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔۔۔!

☆ دعائے صحت کیلئے درخواست

محترمہ بیگم طیبہ آفتاب رکن مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن کے برادر جناب راشد انصاری جو امریکہ میں اپنے اہل خاندان کے ساتھ رہائش پذیر ہیں اور جن کا گزشتہ سال ہیوسٹن کے ایک ہسپتال میں بسلسلہ عارضہء قلب بائی پاس اور ایک میجر آپریشن ٹیومر کی وجہ سے ہوا تھا' آج کل شدید علیل ہیں۔ قارئین کرام سے استدعا ہے کہ ان کی صحت یابی کیلئے دعا فرمائیں۔ شکریہ

نامہ ھای فارسی غالبؔ، مآثر غالبؔ، اور باغ دودر

کے بعد

غالبؔ کی فارسی انشا پردازی، نثر نگاری کے قصر طلسمات یعنی

پنج آھنگ کے آھنگ پنجم کا ترجمہ

ہمارے دور کے صاحب طرز شاعر و معروف غالب شناس پرتوؔ روہیلہ کے قلم سے

جو پُر تاثیر و مسحور کن ہی نہیں مستند بھی ہے۔

ادارۂ یادگار غالب کراچی سے طبع ہو چکا ہے

دیدہ زیب طباعت۔ مضبوط جلد۔ قیمت 250 روپے

بیگم شہلا حسن زیدی

محمد بن قاسم

(پاکستان میں اسلامی تہذیب کا بانی)

اب سے تقریباً تیرہ سو سال پہلے ملک لنکا سے ایک جہاز جس میں مسلمان مسافر سوار تھے' عرب کیلئے روانہ ہوا' جہاز میں تحفے اور تحائف بھی تھے جو لنکا کے راجہ نے مسلمانوں کے خلیفہ کے لئے بھیجے تھے' جب یہ جہاز موجودہ کراچی کے قریب سندھ کی ایک بندرگاہ دیبل کے پاس سے گذرا تو اس کو سندھ کے بحری قزاقوں نے لوٹ لیا اور عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا جب یہ خبر حجاج بن یوسف کو ملی جو اسلامی خلافت کے مشرقی صوبوں کا والی تھا تو اس کے دل پر ایک چوٹ لگی۔

اس نے سندھ کے ہندو راجہ داہر سے تمام مسلمان قیدیوں کو واپس کرنے کا مطالبہ کیا لیکن راجہ داہر نے یہ مطالبہ نہیں مانا جس کی وجہ سے حجاج بن یوسف کو مجبوراً سندھ پر لشکر کشی کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ حجاج نے سندھ پر حملے کے لئے جو فوج روانہ کی اس کا سپہ سالار حجاج بن یوسف کا چچازاد بھائی محمد بن قاسم تھا جس کی عمر اس وقت صرف سترہ سال تھی۔ محمد بن قاسم کی عمر اگرچہ بہت کم تھی لیکن وہ اس کم سنی میں بھی عقل اور سمجھ میں بڑوں کا مقابلہ کرتا تھا جس وقت اس کو سندھ پر حملہ کرنے والی فوج کا سپہ سالار بنایا گیا وہ ایران کے شہر شیراز کا حاکم تھا' اسی شہر سے وہ فوج لے کر سندھ کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے سب سے پہلے مکران کا شہر پنجگور فتح کیا' یہ شہر آج بھی موجود ہے اور اپنی کھجوروں کی وجہ سے مشہور ہے' اس کے بعد اس نے ارمن بیلا فتح کیا' یہ وہی مقام ہے جسے آج کل بیلہ کہتے ہیں اور جو ضلع لسبیلہ کا صدر مقام ہے۔

''ارمن بیلہ'' کی فتح کے بعد یہ نوجوان سپہ سالار اپنی فوجوں کو لئے ہوئے بندرگاہ دیبل پہنچ گیا اور اس کا محاصرہ کر لیا' دیبل کی یہ بندرگاہ موجودہ شہر کراچی کے قریب ہی کسی جگہ تھی' محمد بن قاسم نے اپنی فوج کا ایک حصہ اور بھاری قسم کا سامان سمندر کے راستے سے بھی روانہ کیا تھا' اس سامان میں پانچ منجنیقیں بھی تھیں یہ منجنیقیں پرانے زمانے کی توپیں تھیں جن سے گولوں کے بجائے بڑے بڑے پتھر پھینکے جاتے تھے یہ منجنیقیں اتنی بڑی تھیں کہ ہر ایک کو کھینچنے اور چلانے کیلئے پانچ پانچ سو آدمیوں کی ضرورت پیش آتی تھی یہ منجنیقیں اب پانی کے جہازوں کے ذریعے دیبل پہنچ گئی تھیں۔ پرانے زمانے میں شہروں کی حفاظت کیلئے چاروں طرف اونچی

اور مضبوط دیوار بنا دی جاتی تھی تاکہ دشمن شہر میں داخل نہ ہو سکے' یہ دیوار فصیل کہلاتی تھی بندرگاہ دیبل کے چاروں طرف بھی ایک مضبوط فصیل تھی جس کی وجہ سے مسلمان پوری کوشش کے باوجود شہر میں داخل نہ ہو سکے۔

کہا جاتا ہے کہ شہر دیبل کے وسط میں ایک عبادت گاہ تھی جس کے گنبد پر ایک جھنڈا لہرا رہا تھا لوگوں نے محمد بن قاسم سے کہا کہ جب تک یہ جھنڈا لہراتا رہے گا شہر کے لوگ ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ محمد بن قاسم نے یہ سنا تو اس نے منجنیق عروس کے چلانے والے کو حکم دیا کہ اس گنبد کو نشانہ بنائے۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور ایسی سنگ باری کی کہ گنبد ٹوٹ گیا' اپنی عبادت گاہ کے گنبد کے ٹوٹنے پر سندھی جوش میں آ گئے اور ان کی فوجیں دروازہ کھول کر فصیل کے باہر نکل آئیں۔ مسلمان جو اسی کے منتظر تھے انہوں نے پوری قوت سے حملہ کر دیا اور فصیل پر چڑھ کر شہر میں داخل ہو گئے اور اس پر قبضہ کر لیا' عرب عورتیں اور بچے جن کے متعلق کہا گیا تھا کہ ان کو بحری ڈاکوؤں نے گرفتار کیا ہے' دیبل کے قید خانے میں موجود تھے۔ محمد بن قاسم نے ان سب کو قید و بند کی مصیبت سے آزاد کرایا۔ شہر دیبل رجب ۹۳ھ میں فتح ہوا۔ محمد بن قاسم نے شہر میں ایک جامع مسجد کی بنیاد ڈالی اور ایک بستی بسائی جس میں چار ہزار مسلمان گھرانے آباد کئے یہ پاکستان کی پہلی مسجد تھی اور یہ بستی اس سرزمین میں مسلمانوں کی پہلی بستی تھی۔

دیبل کی فتح کے بعد محمد بن قاسم اپنی فوج لے کر آگے بڑھا اور شہر نیرون فتح کر لیا' یہ وہی جگہ تھی جہاں اب حیدرآباد کا شہر آباد ہے' اس کے بعد اس نے سہون فتح کیا جو اب بھی دریائے سندھ کے کنارے ایک مشہور قصبہ ہے محمد بن قاسم نے اگرچہ سندھ کا بہت بڑا حصہ فتح کر لیا تھا لیکن راجہ داہر سے ابھی تک اس کا مقابلہ نہیں ہوا تھا' یہ مقابلہ سہون کی فتح کے بعد ہوا راجہ داہر کی فوج چونکہ دریائے سندھ کے دوسرے طرف تھی اس لئے محمد بن قاسم کو پہلے دریا پار کرنا پڑا' اتنے بڑے دریا کو فوج کے ساتھ پار کرنا آسان نہیں تھا لیکن محمد بن قاسم نے اس جگہ بڑی سمجھداری سے کام لیا اور دریا کے کنارے کنارے کشتیوں کا ایک پل تیار کروایا' پل تیار ہو گیا تو اس کا نچلا سرا خشکی پر باندھ دیا اور جب رات ہو گئی تو اوپر والے سرے کو دریا میں دھکیل دیا گیا یہاں تک کہ دریا کے بہاؤ کی وجہ سے وہ سرا دوسرے کنارے پر جا لگا اس طرح دریا کے آر پار کشتیوں کا ایک پل تیار ہو گیا' راجہ داہر کی فوج کا ایک دستہ دوسرے کنارے پر موجود تھا لیکن اسے کشتیوں میں بیٹھے ہوئے تیر اندازوں نے بھگا دیا' اس کے بعد محمد بن قاسم اپنی پوری فوج کے ساتھ پل سے گذر کر دریا پار اتر گیا۔

دریائے سندھ پار کرنے کے بعد محمد بن قاسم قلعہ راوڑ کی طرف بڑھا جہاں راجہ داہر اپنی فوجیں

لیے کھڑا تھا یہاں دونوں فوجوں میں دو بدو جنگ شروع ہو گئی جو چار دن جاری رہی لیکن آخری زبردست رن جمعرات ۱۰ رمضان المبارک ۹۳ ھ کو پڑا' راجہ داہر کی فوج کی تعداد اگرچہ ساٹھ ہزار تھی اور مسلمان فوج کی تعداد صرف ساڑھے پندرہ ہزار تھی لیکن محمد بن قاسم نے ایسی فوجی قابلیت کا ثبوت دیا کہ سورج ڈوبنے تک اپنے سے چار گنا فوج کو شکست دے دی مسلمانوں کو مکمل فتح ہوئی اور راجہ داہر مارا گیا یہ جنگ جور اور کے مقام پر ہوئی تھی تاریخ پاکستان کی فیصلہ کن جنگ تھی اس نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اب پاکستان کی تہذیب اسلامی تہذیب ہوگی اور یہ خطہ اسلامی دنیا کا ایک حصہ ہوگا ۱۰ رمضان ۹۳ ھ کا دن جبکہ یہ فتح حاصل ہوئی تاریخ پاکستان کا ایک یادگار دن ہے۔ راجہ داہر کے مارے جانے کے بعد ہندوؤں کی مزاحمت کمزور پڑ گئی محمد بن قاسم نے جلد ہی سندھ کے دارالحکومت برہمن آباد اور ایک اور بڑے شہر الور پر قبضہ کر لیا یہ دونوں شہر سندھ کے گرمائی اور سرمائی دارالحکومت تھے ان کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے ملتان کا رخ کیا جو راجہ داہر کے بھتیجے گورسکھ کی حکومت میں شامل تھا اور اس زمانے میں سندھ کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا' ملتان ایک طویل محاصرے کے بعد فتح کر لیا گیا اور اس طرح وہ سارا علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا جو اب پاکستان کے وسطی اور جنوبی حصے پر مشتمل ہے' ملتان کے بعد محمد بن قاسم بھارت کو فتح کرنا چاہتا تھا جس کا بڑا حصہ قنوج کے راجہ کی حکومت میں تھا لیکن وہ ابھی لڑائی کی تیاریاں کر ہی رہا تھا کہ دارالخلافہ دمشق سے اس کی واپسی کا حکم آ گیا۔ ہوا یہ کہ فتح ملتان کے بعد حجاج بن یوسف کا انتقال ہو گیا جس نے محمد بن قاسم کو سندھ کی مہم پر روانہ کیا تھا۔ حجاج بن یوسف کے آٹھ ماہ بعد دمشق میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کا بھی انتقال ہو گیا' ولید کی جگہ اس کا بھائی سلیمان خلیفہ ہوا جو حجاج اور اس کے رشتہ داروں سے ناراض تھا محمد بن قاسم چونکہ حجاج کا چچا زاد بھائی تھا اس لئے سلیمان نے اس کو واپس بلا لیا' یہ واقعہ ۹۶ ھ کا ہے واپسی پر محمد بن قاسم کو حجاج کے جانشین نے قید کر دیا۔ اور کچھ عرصے بعد قید ہی میں اس کا انتقال ہو گیا' محمد بن قاسم کی موت تاریخ اسلام کے افسوسناک واقعات میں سے ہے محمد بن قاسم نے اپنے کارناموں سے ثابت کر دیا تھا کہ وہ نہ صرف ایک اچھا سپہ سالار تھا بلکہ ایک رعایا پرور قابل اور منصف مزاج حاکم بھی تھا' پھر عقل حیران ہوتی ہے کہ اس نے یہ کارنامے بہت کم عمری میں انجام دیئے۔ دیبل کی فتح کے وقت اس کی عمر صرف سترہ سال تھی اور جب سندھ فتح کر کے واپس گیا تو اس کی عمر بیس سال تھی' اتنی کم عمر میں اتنے شاندار کارنامے شاید ہی دنیا میں کسی نے انجام دیئے ہوں۔ ایک عرب شاعر نے اس کی موت پر ایک مرثیہ لکھا تھا جس میں اس نے کہا تھا۔

''سترہ برس کی عمر میں یہ سردار بن گیا اور اس کے ہم عمر لڑکے ابھی کھیل ہی میں لگے ہوئے ہیں۔ محمد

بن قاسم کو خود بھی اپنی صلاحیت اور کارناموں کا احساس تھا' چنانچہ جب اسے قید کیا گیا تو اس نے ایک شعر پڑھا جس کا ترجمہ یہ ہے۔ "لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور ایک ایسے جوان کو ضائع کیا جو مصیبت کے دن کام آئے اور سرحدوں کی مضبوطی کے لئے مناسب ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ محمد بن قاسم کے واپس جانے سے اسلامی حکومت کو سخت نقصان پہنچا اگر اس کو واپس نہ بلایا جاتا تو شاید وہ برصغیر پاکستان و ہند کا بیشتر حصہ ضرور فتح کر لیتا اور یہ وسیع خطہ پانچ سو برس پہلے ہی اسلامی دنیا کا ایک حصہ بن چکا ہوتا۔ اس کے بعد کوئی ایسا قابل صوبہ دار سندھ میں نہیں آیا جو اسلامی سلطنت کی حدود میں اضافہ کر سکتا۔ محمد بن قاسم کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس نے فتوحات کے دوران وہ ظلم و زیادتی نہیں کی جو عام طور سے دنیا کے فاتح کیا کرتے ہیں۔ اس کی تلوار کا شکار صرف وہی لوگ ہوئے جنہوں نے مقابلہ کیا۔

سندھ کے باشندے اس زمانے میں بدھ اور ہندو مذہب کے پیرو تھے محمد بن قاسم نے ان کو پوری مذہبی آزادی دی اور ان کو یہ حق دیا کہ وہ آپس کے جھگڑے خود ہی اپنی پنچائتوں میں طے کر لیا کریں محمد بن قاسم نے محصول جمع کرنے کا کام بھی مقامی باشندوں کے ہاتھ میں دے دیا تھا جن سندھیوں کو لڑائی میں نقصان پہنچا تھا اس نے سندھ فتح ہونے کے بعد ان کے نقصان کی تلافی بھی کی۔ مختصر یہ کہ محمد بن قاسم نے جو اسلامی حکومت یہاں قائم کی وہ اگرچہ عربوں کی تھی لیکن اس نے سندھ میں ایک ایسا منصفانہ نظام قائم کیا جو خود وہاں کے غیر مسلم باشندے قائم نہیں کر سکے تھے۔ اس نے سندھ میں قانون کی حکومت قائم کی اور ان تمام بُری باتوں پر پابندی لگا دی جو معاشرے کو خراب اور گندہ کرتی ہیں' شراب پر جو انسان کو حیوان بنا دیتی ہے پابندی لگائی۔ رنگ و نسل کا امتیاز ختم ہو گیا اور ذات پات کی اہمیت جاتی رہی جس کا سندھ میں بہت زور تھا جس کی وجہ سے انسان کی صلاحیتیں محدود ہو گئی تھیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی باشندے عربوں سے خوش ہو گئے اور ان کے دلوں سے ڈر نکل گیا جو اسلامی فتوحات کے وقت پیدا ہو گیا تھا' اسلام کی تعلیم اور اسلامی نظام کی برکت سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ آہستہ آہستہ پورے سندھ میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی۔ سندھی زبان کا رسم الخط بھی عربی ہو گیا' اس طرح یہ علاقہ جو اب پاکستان ہے ہمیشہ کے لئے اسلامی دنیا کا حصہ بن گیا۔

محمد بن قاسم نے تیرہ سو سال پہلے ہمارے وطن میں اسلامی تہذیب کا جو پودا لگایا تھا وہ آج ایک عظیم الشان درخت بن چکا ہے' پاکستان اسلامی دنیا کا ایک عظیم ترین ملک ہے اور اسی تعلیم اور پیغام کا علمبردار ہے جو محمد بن قاسم اپنے ساتھ لایا تھا۔ محمد بن قاسم اگرچہ عرب تھا لیکن وہ ہمارا سب سے بڑا محسن ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اسے تاریخ پاکستان کے مشہور لوگوں میں شمار کیا ہے۔ جو واقعی اس کا حق بھی ہے۔

ترتیب و تدوین

شہلا احمد

عوام میں پذیرائی حاصل کرنے والے ادب کے لئے ضروری نہیں کہ وہ تنقید کے معیار پر بھی پورا اترتا ہے

---- ممتاز ادیب اور شاعر سید منصور عاقل سے خصوصی انٹرویو ----

صدر الاقرباء فاؤنڈیشن جناب سید منصور عاقل گذشتہ دنوں برطانیہ تشریف لے گئے جہاں ان کے قیام کے دوران متعدد علمی و ادبی تقاریب کا اہتمام کیا گیا۔ لندن سے ایک گھنٹہ کی خصوصی ٹیلی وژن ٹرانسمشن میں دیگر امور کے علاوہ آپ نے "الاقرباء" کے اغراض و مقاصد اور اس کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ لندن ہی میں جناح سوسائٹی اور پاکستان پروفیشنلز انٹرنیشنل کے زیر اہتمام حسرت موہانی مرحوم کی یاد میں ہوٹل شیلبورن میں منعقد ہونے والے اجلاس کی صدارت کی جس میں جناب مراد علی ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان برائے برطانیہ نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ کئی دیگر ادبی محافل اور مشاعرے بھی آپ کے اعزاز میں منعقد کئے گئے جن میں برطانیہ میں مقیم اردو شعر و ادب سے متعلق اہل قلم نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ ذیل میں ہم اس مفصل انٹرویو کا متن اپنے اراکین کے لئے شائع کر رہے ہیں جو لندن سے شائع ہونے والے اخبار پاکستان پوسٹ میں مورخہ ۲۸ مئی ۲۰۰۴ء کو شائع ہوا اور جس کی نقل ہم نے انٹرنیٹ سے حاصل کی۔ (مدیر مسئول)

ملاقات: فیضان عارف

ممتاز شاعر اور ادیب منصور عاقل ۲۹ جون ۱۹۳۴ء کو یو پی میں ضلع بلند شہر کے قصبہ گلاؤٹھی میں پیدا ہوئے۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں وہ اپنے خاندان کے ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ ۱۹۵۳ء میں انہوں نے دیال سنگھ کالج لاہور سے گریجویشن کیا۔ ۱۹۵۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے پولیٹیکل سائنس اور ۱۹۵۷ء میں ایم اے تاریخ کا امتحان پاس کرنے کے بعد لیکچرار کے طور پر مختلف کالجوں میں درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ ۱۹۵۸ء میں انہوں نے انفارمیشن سروس میں ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۷۳ء تک اس ادارے میں ڈسٹرکٹ ڈویژنل اور ریجنل سربراہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۹۴ء تک وہ وفاقی حکومت سے منسلک رہے۔ اس دوران وہ پنجاب اربن ٹرانسپورٹ کے مینیجنگ ڈائریکٹر وفاقی محتسب سیکرٹریٹ میں ڈائریکٹر جنرل، نیشنل سیونگ (قومی بچت) کے ڈائریکٹر جنرل اور چیف احتساب کمشنر کے ادارے میں بعہدہ کنسلٹینٹ فائز رہے۔ لاہور میں زمانہ طالب علمی کے

دوران ہی انہوں نے ملک کے قومی اخبارات ورسائل کے لئے لکھنے کا آغاز کر دیا تھا۔ وہ ''لائلپور اخبار'' کے چیف ایڈیٹر اور سہ ماہی افق بہاول پور کے مدیر اور اردونامہ کے بانی مدیر رہے۔ تاریخ اور ادب کے موضوع پر ان کی نصف درجن کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں ان کا شعری مجموعہ گہوارہ سخن بھی شامل ہے۔ ان دنوں وہ اسلام آباد سے سہ ماہی ادبی جریدے الاقرباء کے بورڈ آف ایڈیٹرز کے چیئرمین ہیں۔ سید منصور عاقل گزشتہ دنوں برطانیہ آئے تو پاکستان پوسٹ نے ان سے خصوصی انٹرویو کیا جس کی تفصیل تحریر کی جارہی ہے۔

س: آج کل جو اردو ادب تخلیق ہو رہا ہے اس کا عالمی ادب میں کیا مقام ہے اور مستقبل کے حوالے سے کیا امکانات ہیں؟

ج: پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی ادب اپنے تاریخی تناظر میں سب سے پہلے اپنے تشکیلی لوازمات کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ ابلاغ اور اظہار ادب کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور جب تک ابلاغ اور اظہار میں ہمہ گیریت اور گہرائی نہ ہو اور وہ انسانی اذہان جو ادب کے حوالے سے سوچتے ہیں انہیں اپنے افکار کے لئے الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے اور جب تک موزوں الفاظ نہ ملیں خیالات کی صحیح ترسیل مشکل ہو جاتی ہے چنانچہ اردو ادب کے حوالے سے اگر ہم بات کریں تو اس کی تاریخ بہت طویل ہے۔ لفظی تشکیل کے اعتبار سے اردو ادب کی ایک ہیئت اور ایک شکل ایک دور میں ایسی بھی تھی کہ آج کے قاری کو اگر وہ صفحات پڑھنے کیلئے دے دیئے جائیں تو وہ گھبرا اٹھے گا۔ اردو زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں روز اول سے ہی یہ صلاحیت ہے کہ کسی بھی زبان کے الفاظ کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ اردو ادب لفظی تشکیل و تعمیر کے حوالے سے بھی مختلف ادوار سے

گزرا اور افکار کے ارتقا کے حوالے سے بھی اس نے ترقی کی۔ جب ہم ادب کی بات کرتے ہیں تو افکار کے ارتقا کے حوالے سے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک پہلو تو داخلی ہے جو کہ بنیادی اور اہم ترین پہلو ہے۔ بعض لوگ اس کو اتنی اہمیت نہیں دیتے لیکن میرے پاس وجوہ موجود ہیں اس لئے میں داخلیت کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ انسان کے اندر چاہے جذبات کا ہیجان ہو۔ خیالات کا طوفان ہو ان دونوں کا امتزاج یا ان دونوں کے درمیان کوئی توازن یا عدم توازن ہو یہ سب ہی بنیادی اہمیت رکھتے ہیں چنانچہ نثر اور نظم دونوں میں ایک ایسا ادب ارتقا پذیر رہا اور اب جب ہم ادبی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ عمل واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ داخلیت کے حوالے سے ہر شخص نے ایک ہی بات کو مختلف انداز اور طریقوں سے کہا مثلاً میر کا مشہور شعر ہے:

وہ آئے بزم میں تو اتنا تو ہم نے دیکھا میر پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

بات مزید آگے چلتی ہے اور جگر کا ایک شعر اسی موضوع کے حوالے سے ہے لیکن مختلف انداز فکر اور مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ شعر ہے:

کمال حسن کا اپنے دکھا دیا تو نے چراغ سامنے رکھ کر بجھا دیا تو نے

آپ خود اندازہ کریں کہ ادب میں پھیلنے کی اور تہہ تک اترنے کی کتنی صلاحیتیں ہیں لیکن ان تمام صلاحیتوں کا انحصار اظہار اور ابلاغ پر ہے جو کسی شخص کے اپنے انداز فکر کو ظاہر کرتا ہے۔ ہمارا ادب ترقی کرتے کرتے جب عصر حاضر میں پہنچا ہے تو افسانہ ہو، ڈرامہ، نظم ہو یا غزل، پھر نظم کی مختلف اصناف ہیں مثلاً رباعی ہے مخمس، مسدس اور مرثیہ وغیرہ وغیرہ تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ جیسے ایک درخت کی جڑیں توانا ہوتی ہیں اور جب وہ ابھرتا ہے اور نمو پاتا ہے تو اس کی توانائی اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ اس درخت کی جڑیں کتنی مضبوط ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اردو ادب کی جڑیں بہت مضبوط ہیں اور ان جڑوں کی طاقت سے جو پودا نمو پذیر ہوا ہے اس کا تنا بھی بہت مضبوط ہے اور وہ توانائی پھر ہمارے ادب کی شاخوں یعنی اس کی اصناف سخن میں بھی منتقل ہوئی۔ مختصراً میں یہی عرض کروں گا کہ ہمارے ہاں ہر دور کے ادب نے اولاً ادیب یا شاعر کی داخلی کیفیات کی ترجمانی کی ہے اور دوم یہ کہ جس دور میں بھی وہ ادب تخلیق کیا گیا ہے، اس کی نمائندگی کی گئی ہے۔ لیکن پچھلی ایک صدی کے دوران اردو ادب پر مغربی ادب کے اثرات کافی غالب آئے۔ ہر چند کہ اس کی نشو و نما فارسی کی قرابت اور فارسی کے ماحول مین ہوئی لیکن بات آگے بڑھی تو مغربی ادب نے ہمارے لکھنے والوں کو بہت متاثر کیا۔ میں اختر شیرانی کی مثال دوں گا۔ انگریزی ادب نے شیلے اور کیٹس جیسے رومینٹک

شاعر پیدا کیے چنانچہ یہ اثرات اردو شاعری میں بھی نظر آتے ہیں اور میں ذاتی طور پر پوری ذمہ داری سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اختر شیرانی کا تو میں نے صرف ایک نام لیا ہے اس کے علاوہ بھی اردو شاعری میں بے شمار ایسی مثالیں موجود ہیں۔ ایسے شعراء کی محض فہرست نہیں بلکہ ایک کہکشاں ہے ان میں سے کسی کو بھی آپ پیش کر دیں تو وہ شیلے، کیٹس اور اس جیسے دوسرے شاعروں کا نعم البدل ہو سکتے ہیں۔ انکی لوسی اور فینسی براؤن اختر شیرانی کی سلمٰی اور عذرا سے زیادہ خوبصورت نہیں ہیں۔ مثلاً اختر شیرانی کہتے ہیں۔

تمہیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے ۔۔۔ حسین چاند نے بھی بار بار دیکھا ہے
کبھی گئی ہو چمن میں تو مست پھولوں نے ۔۔۔ نگاہِ شوق سے دیوانہ وار دیکھا ہے
سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے ۔۔۔ شفق نے تم کو سرِ جوئبار دیکھا ہے
غرض مظاہر فطرت نے ہر طرح تم کو ۔۔۔ ہزار بار نہیں لاکھ بار دیکھا ہے
مگر مری نگہ شوق کو شکایت ۔۔۔ کہ اس نے تم کو فقط ایک بار دیکھا ہے

ہمارے ادب پر علاقائی ممالک کے اثرات بھی ہیں اور ہمارے ادب نے انہیں بھی متاثر کیا ہے لیکن سوائے جغرافیائی امتیازات کے مغربی ادب نے ہمیں خاصا متاثر کیا ہے مثلاً انگریزی ادب میں دھوپ کی جو اہمیت ہے ہمارے ہاں اردو غزل میں وہی اہمیت سائے اور بادل کی ہے۔ وہاں بادل زیادہ خوبصورت ہیں' یہاں دھوپ زیادہ خوبصورت ہے چنانچہ اگر ہم امتیازات سے صرف نظر کریں تو پتہ چلتا ہے کہ باہمی منتقلی وسیع پیمانے پر ہوئی ہے اور دونوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا ہے۔

س: جتنا اردو ادب تخلیق ہوا ہے عالمی سطح پر کبھی اس کو اہمیت نہیں دی گئی۔ ہر سال ادب کا نوبل پرائز دیا جاتا ہے ٹیگور جو کہ بنگالی شاعر تھے ان کو بھی یہ انعام ملا۔ ہمارا ادب اس شمار میں کیوں نہیں ہوتا کہ نوبل انعام کے لئے اس پر بھی غور کیا جائے؟

ج: اردو ادب سے بے شمار تراجم نہ صرف انگریزی بلکہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہو چکے ہیں اور تراجم صرف اسی وقت ہوتے ہیں جب دوسری زبان میں انہیں منتقل کرنے والے اذہان اور افراد ان کی افادیت اور اہمیت کے معترف ہوں۔ پہلا نقطہ تو یہ ہے کہ اگر اردو ادب میں اتنی وقعت پیدا نہ ہو چکی ہوتی تو اس کے ترجمے دوسری زبانوں میں ہرگز نہ ہوتے۔ شیکسپیئر کیلئے کارلائل نے ایک جملہ کہا تھا کہ

"Indian empire or non-Indian empire, we can not do without Shakspeare".

میں ان اصحاب سے پوچھتا ہوں جو غالب کی عظمت سے پوری طرح متعارف ہیں اور اس کی ہمہ جہت فکر کے معترف ہیں۔ اس کا بھرپور مطالعہ کیا ہے اور غالب کے تراجم دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ غالب کا ایک اردو نسخہ ''دیوان غالب'' برلن سے سالہا سال پہلے چھپ چکا ہے تو کیا ایسی بات ہم غالب کے بارے میں نہیں کہہ سکتے؟ چنانچہ میرا جواب یہی ہے کہ نوبل پرائز دینے کا معیار اور ان کی پرکھ کرنے والے حضرات جو پیرامیٹر خود طے کرتے ہیں نوبل انعام کا انحصار اسی پر ہوتا ہے لیکن میں اردو ادب کو اتنا حقیر اور مفلس نہیں سمجھتا کہ اسے زیر غور نہ لایا جائے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اگر بین الاقوامی سطح پر اقبال کے فکر و فن کا جائزہ لیا جائے تو کیا وہ نوبل انعام کے قابل شخص نہیں تھا۔ میرے خیال میں اقبال کو نوبل پرائز نہ ملنا نوبل پرائز کی محرومی ہے۔

☆ علامہ اقبال کو نوبل پرائز نہ ملنا نوبل پرائز کی محرومی ہے۔

☆ اردو زبان کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دوسری زبان کے الفاظ جذب ہو جاتے ہیں۔

فیض احمد فیض کو روس نے انعام دیا جو لوگ نوبل انعام دینے کیلئے پیرامیٹرز مقرر کرتے ہیں اگر وہ لوگ پیرامیٹر مقرر کرتے وقت اقبال اور فیض جیسی شخصیات کو زیر غور لائیں تو میرے خیال میں ہم مایوس نہیں ہوں گے اور مستقبل میں انشاء اللہ ایک وقت ایسا آئے گا جب اردو ادب لکھنے والوں کو اس اعزاز کیلئے زیر غور لایا جائے گا۔

س: وہ ادب زیادہ اہم ہے جس کو پڑھنے والے سراہیں یا وہ ادب اچھا ہے جس کی نقاد تعریف کریں؟

ج: وہ ادب زیادہ اہم ہوتا ہے جو زیادہ سے زیادہ اذہان کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور جس کی زیادہ سے زیادہ پذیرائی ہو۔ جہاں تک نقاد حضرات کی بات ہے تو نقادوں کے پیمانے ہمیشہ فنی اور علمی نوعیت کے ہوتے ہیں اور انکی توجہ اس طرف عام طور پر کم جاتی ہے کہ کسی ادیب یا شاعر کو عام قارئین میں کس حد تک پذیرائی حاصل ہے۔ ہمارے ہاں جو تنقیدی لٹریچر تخلیق ہوا ہے اگر ہم اس کا جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ ہمارے بڑے بڑے لکھنے والوں پر تنقیدیں ہوئیں اور اکثر کے کلام کو بہت زیادہ ہدف تنقیص بھی بنایا گیا لیکن اس کے باوجود ان لوگوں نے جو شہرت حاصل کی اس شہرت کا جواب یا اس کے خلاف کوئی جواز ہمارے نقاد حضرات کے پاس کبھی نہیں رہا لیکن اس کے معنے یہ ہرگز نہیں ہیں کہ تنقید کا ادب میں کوئی منصب نہیں ہے۔ ادب میں طہارت، رچاؤ اور روشنی کا عنصر غالب لانے کیلئے تنقید بہت ضروری ہے۔ تنقید ایسے ہی ہے جیسے کوئی مالی گلشن

میں اپنی قینچی لے کر پھول پودوں کی تراش خراش کرتا ہے اور وہ پھر خوبصورت نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ نیاز فتح پوری مرحوم سے بہت سے لکھنے والے شاکی تھے کہ ان کا قلم کبھی بھی جانبداری سے کام نہیں لیتا تھا۔ وہ جس بات کو ادب میں صحیح سمجھتے تھے وہ تنقید کر ڈالتے تھے۔ بعض حضرات ان کی تنقید کے نتیجے میں ناراض ہو جاتے تھے لیکن دیکھا جائے تو ان کی تنقید نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ ہمارے ہاں جو نقاد حضرات ہیں انہوں نے ادب کو سنبھلنے اور بہتر سے بہتر روش اختیار کرنے کیلئے راہیں بھی دکھائیں۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ تنقید اپنی جگہ اہم ہے لیکن وہ ادب جو عوام میں پذیرائی حاصل کرتا ہے اس کیلئے ضروری نہیں ہے کہ وہ تنقید کے معیار پر پورا اترتا ہو۔

س: ایک زمانہ تھا کہ لوگ ادبی رسائل بڑے شوق سے پڑھتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب نہ تو اس معیار کے ادبی رسالے نکلتے ہیں اور نہ ہی لوگوں کے پاس وقت ہوتا ہے۔ قارئین کی تعداد محدود ہوتی جا رہی ہے۔ آپ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں اس صورتحال کو کس تناظر میں دیکھتے ہیں؟

ج: یہ ایک المیہ ہے کہ سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کو اس بات پر محمول کر دیا گیا ہے کہ اس کے نتیجے میں ادب پس پشت جا پڑے گا اور یہ عملاً ہو رہا ہے۔ اس کے اسباب یہ ہیں کہ تمام دنیا کا ثقافتی نظام بڑی تیزی سے ایک تبدیلی کے عمل کے زیر اثر آ رہا ہے اور عالمی ثقافت کی پرانی اقدار یا تو پامال ہوتی جا رہی ہیں یا ان کی جگہ نئی اقدار لے رہی ہیں۔ آج کے دور میں انسان کی سب سے بڑی ضرورت معاشی ضرورت قرار دی گئی ہے اور دوسری سب سے بڑی ضرورت اس کی سیکورٹی کی ضرورت چنانچہ سائنس و ٹیکنالوجی نے جہاں نئی نئی جہتوں سے عالم انسانیت کو متعارف و روشناس کرایا وہاں ادب کے حوالے سے ایک عملاً نقصان ہوا ہے کہ اب لوگوں کے پاس معاشی تگ و دو میں مصروف رہنے کے بعد اتنا کم وقت رہ گیا ہے کہ وہ سوچتے ہیں کہ یہ کم وقت ہم اپنی کسی اور فلاحی ضرورت کی طرف صرف کریں یا ادب کے مطالعے پر صرف کریں۔ اب سے پہلے زندگی میں ایک ٹھہراؤ کی سی کیفیت تھی۔ اس ٹھہراؤ کی جگہ اب ایک ہیجان اور تیز رفتاری نے لے لی ہے۔ اس سے پہلے ہماری معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی اقدار ہم میں صبر و تحمل اور ضبط و برداشت کی صفات پیدا کرتی تھیں لیکن سائنس و ٹیکنالوجی نے ہمیں تیز رفتاری پر مجبور کر دیا ہے اور اس تیز رفتاری کے نتیجے میں ادب بڑی حد تک پامال ہوا ہے۔ میں سائنس و ٹیکنالوجی کی افادیت سے منکر نہیں ہوں اور اس کا انکار کرنا کوئی دانشمندی بھی نہیں ہے لیکن اس میں ایک توازن کی ضرورت ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ معاشرے جو آج بھی اس کوشش میں

مصروف ہیں کہ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کیساتھ ساتھ وہ اپنی معاشرتی اور تہذیبی' تمدنی اور ثقافتی روایات کو بہتر بنانے کیلئے بھی کچھ وقت صرف کریں۔ ہمارے ہاں بھی یہ کوشش پائی جاتی ہے۔ لیکن اس پر بھی سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کا غلبہ نظر آتا ہے مثلاً کمپیوٹر کے آجانے کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ تمام نئی نسل کی توجہ کا محور و مرکز کمپیوٹر بن کر رہ گیا ہے۔ آج ہمارے بچے دو کا پہاڑہ نہیں جانتے' اگر انہیں چھ اور چار جمع کرنے کو کہا جائے تو فوراً انگلیاں کیلکولیٹر کی طرف بڑھتی ہیں۔ وہ پہلے چھ کا بٹن دبائیں گے پھر پلس کا اور پھر چار کا بٹن اور آخر میں آپ کو بتا دیں گے کہ چھ اور چار دس ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی میں مشین کا اتنا دخل آگیا ہے کہ اس نے انسان کی معاشی' تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے چنانچہ ان کے نتیجے میں جو کچھ ادب بھی لکھا اور پڑھا جا رہا ہے وہ بہت دھندلا چکا ہے اور پس پشت جا پڑا ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے پاس ادبی جرائد اور رسائل موجود ہیں۔ میں نے ریٹائرمنٹ کے بعد محسوس کیا کہ اپنے ذاتی ادبی رجحانات اور ادبی ذوق کے حوالے سے اس شعبے میں کچھ کام کروں' چنانچہ پچھلے پانچ سال سے ہم نے ایک میگزین کا اجراء کیا ہے اور اس کا پس منظر بھی یہ ہے کہ ایک فلاحی ادارہ الاقرباء فاؤنڈیشن کے نام سے اسلام آباد میں سرگرم عمل ہے۔ مجھے اس کا چیئرمین ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور میری گزارش پر انہوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ ایک خالص علمی اور ادبی مجلّہ جو بالکل غیر تجارتی' غیر سیاسی ہو' جاری کیا جائے لیکن ان کی شرط یہ تھی کہ نام ان کا ہونا چاہیے۔ ہم نے اس بات سے اتفاق کر لیا کیونکہ نام کی بجائے کام زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ میں نے اس میگزین کا حوالہ اس لئے دیا کیونکہ اس کی بنیادی صفت یہ ہے کہ اس میں جو بھی مواد چھپتا ہے وہ پہلے کہیں شائع نہیں ہوا ہوتا جس کے معنے یہ ہیں کہ یہ تازہ تخلیقات پر مشتمل ہوتا ہے اور اس میں جو مضامین اور مقالات ہوتے ہیں وہ تخلیقی یا تحقیقی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ ایک بہت بڑا حلقہ ایسا ہے جنکا علمی و ادبی اداروں سے تعلق ہے یا وہ طلبہ جو ادب پر تحقیق کا کام کر رہے ہیں اور پی ایچ ڈی کے مقالات مرتب کر رہے ہیں۔ ان کیلئے ہمارا میگزین بہت مفید ثابت ہو رہا ہے اس کے علاوہ پاکستان سے بہت سارے مجلے اور جرائد نکل رہے ہیں' الاقرباء بھی ان میں شامل ہے اور سب کو یہی چیلنج درپیش ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں ان کو کس طرح اپنا وجود باقی و قائم رکھنا ہے۔ یہ کوشش جاری ہے اور دیکھتے ہیں کہ انجام کار کیا ہوتا ہے۔

س: پاکستان میں دوہرا تعلیمی معیار ہے اور انگریزی بولنے اور پڑھنے کو برتری کی علامت سمجھا جاتا ہے' اسی طرح غیر ضروری طور پر اردو زبان میں انگریزی کی آمیزش ہوگئی ہے۔ اس ساری صورتحال پر آپ کیا تبصرہ کریں گے؟ کیا

اردو زبان رو بہ تنزل ہے؟ کیا یہ اس میں بہتری آ رہی ہے یا یہ اپنی ارتقائی منازل سے گزر رہی ہے؟

ج: پہلی بات تو یہ ہے کہ میں صرف اسے اردو نہیں سمجھتا جو موجودہ ذخیرہ الفاظ پر مشتمل ہے بلکہ میں اسے بھی اردو سمجھتا ہوں جو دوسری زبانوں سے ہماری زبان میں داخل ہوتے ہیں اور مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں' ہاسپٹل انگریزی کا لفظ ہے اب اگر اس سے ہسپتال بن گیا اور وہ رواج پا گیا تو کیا ضروری ہے کہ ہم شفا خانہ ہی کہیں؟ ہسپتال کے لفظ کو ہر شخص سمجھتا ہے تو ایسی صورت حال میں ہمیں یہ تعصب نہیں برتنا چاہئے کہ فلاں لفظ انگریزی سے آیا ہے سٹوڈیو' سٹیشن' ریلوے جیسے الفاظ اس کی مثال ہیں۔ ہاں اگر اردو میں ایسے الفاظ ہیں جو ہر کوئی بول اور سمجھ سکتا ہے اور اس کے باوجود ہم انگریزی کے الفاظ استعمال کریں تو میں اسے اردو زبان کے ساتھ زیادتی قرار دوں گا۔ اردو زبان کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت بخشی ہے کہ اس کے بازو کھلے ہیں' اردو زبان ایک مسلسل عمل کے تحت دوسری زبانوں سے الفاظ قبول کر رہی ہے مثلاً پاکستان میں جو اردو ۱۹۴۷ء یا ۱۹۴۸ء میں بولی جاتی تھی آج وہ اردو بہت مختلف ہو چکی ہے اور اس میں پاکستان کی دوسری زبانوں کے بے شمار الفاظ شامل ہو چکے ہیں اور میں اور آپ ان الفاظ کو غیر محسوس طور پر استعمال کرتے ہیں' اردو زبان کو اللہ نے اتنی صلاحیت بخشی ہے کہ اس کو تحفظ کی ضرورت ہی نہیں ہے' یہ اپنا تحفظ خود کرتی ہے اور نئے سے نئے سانچوں میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آج کل الیکٹرانک میڈیا پر ایسی زبان سننے میں آ رہی ہے کہ ایک یا دو لفظ بمشکل اردو کے بولتے ہیں اور باقی تمام انگریزی کے جملے ہوتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ان اشخاص کا احساس کمتری ہے اور یہ اس غلامانہ ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے کہ جس نے ہمیں یہ غلط احساس دے دیا کہ انگریزی بولنے کے معنے برتری کے ہیں۔ آپ کو جتنی زیادہ زبانیں آتی ہوں اتنی اچھی بات ہے لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہوتے کہ آپ کسی بھی زبان کو مسخ کرنا شروع کر دیں۔ زبان تو اظہار خیالات کا ایک ذریعہ ہے' علم علیحدہ چیز ہے' زبان علیحدہ چیز ہے۔ اگر آپ فارسی' عربی یا انگریزی بولتے ہیں تو اسے آپ کی جہالت یا علمیت کا معیار نہیں قرار دیا جا سکتا جب تک کہ آپ اس زبان میں واقعی جہالت یا علمیت کا مظاہرہ نہ کریں۔ لفظ تو لفظ ہوتے ہیں' الفاظ کے پیچھے ایک ذہن اور علمی پس منظر ہوتا ہے۔ جب تک وہ علم لفظوں میں نہ ڈھلے ان لفظوں کو وقعت حاصل نہیں ہوتی' میں انگریزی یا کسی بھی زبان کے الفاظ اردو میں شامل کرنے کے خلاف نہیں ہوں لیکن اعتدال سے گزر جانے کے خلاف ہوں ہمیں کوشش یہ کرنی چاہیے کہ اردو کی شکل وصورت کو مسخ نہ ہونے دیا جائے' ہم پر اولین محبت کا حق اردو زبان کا ہے۔

س: پاکستان میں زبان کی بقا کے حوالے سے مختلف ادبی ادارے ہیں مثلاً مقتدرہ قومی زبان اور اکادمی ادبیات وغیرہ' کیا یہ ادارے زبان' ادب اور ادیبوں' شاعروں کی فلاح و بہبود کیلئے کچھ کام کر رہے ہیں اور زبان و ادب کے فروغ میں ان اداروں کا کیا کردار بنتا ہے؟

ج: جب ادارے قائم ہوتے ہیں تو ان کے قیام کے پس منظر میں ایک نصب العین کارفرما ہوتا ہے۔ اکادمی ادبیات کے قیام کا پس منظر واضح ہے کہ پاکستان میں ادب کے فروغ کیلئے یہ ادارہ کام کرے گا اب ادب صرف وہ نہیں ہے جو اردو میں تخلیق ہو رہا ہے بلکہ پاکستان کی مختلف زبانوں میں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے اس کو بھی فروغ دینا ماضی میں لکھے گئے' ادب کو محفوظ کرنا اور اس ورثے کو آگے بڑھانا بھی اکادمی ادبیات کا کام ہے۔ اس سلسلے میں مختلف آراء ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب ایک ادارہ قائم ہو گیا ہے تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ کام کرتا ہے۔ یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ اکادمی ادبیات نے جتنا کام کیا ہے اسے اس سے زیادہ کام کرنا چاہیے تھا لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ اکادمی نے کچھ نہیں کیا' کیونکہ اکادمی ادبیات نے کتابیں چھاپیں ہیں' ان کا باقاعدگی سے ایک مجلہ شائع ہوتا ہے' وہ بین الاقوامی سطح پر بھی روابط اور رشتے قائم کر رہے ہیں۔ پاکستانی ادیبوں کو بیرون ممالک بھجوایا جا رہا ہے' بیرون ممالک سے بھی ادیب پاکستان آتے ہیں' کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ میں بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان اداروں کو زیادہ فعال ہونا چاہیے۔ مقتدرہ قومی زبان کے پس منظر میں بھی ایسا ہی ایک نیک مقصد ہے کہ اردو ہماری قومی زبان ہے اور اسے دفتروں میں نافذ کیا جائے۔ اس سلسلے میں آئینی شقیں رکھی گئیں لیکن وہ وقت بھی گزر گیا اور اردو زبان دفتروں میں نافذ نہ ہو سکی۔ اس کی بہت سی سیاسی اور غیر سیاسی وجوہات ہیں کچھ تجاہل عارفانہ سے بھی کام لیا گیا' جان بوجھ کر تاخیر کی گئی کچھ حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ وہ انگریزی میں بہتر کام کر سکتے ہیں اور اگر اردو نافذ ہو گئی تو ان کی استعداد میں کمی آ جائے گی۔ لیکن اس کے باوجود مقتدرہ قومی زبان نے بے شمار کتب شائع کی ہیں جو اس مقصد کی طرف سنگ ہائے میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مقتدرہ میں جتنا کام ہو چکا ہے وہ اتنا موثر ہے کہ حقیقتاً اب صرف بٹن دبانے کی دیر ہے اور آپ اردو کو نافذ کر سکتے ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان نے اردو کے دفتری نفاذ کے سلسلے میں جو تازہ ترین اقدامات کیے ہیں ان میں سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مرکزی حکومت کی دفتری ہدایات اور قواعد و ضوابط سے متعلق جو ضخیم کتاب ہے اس کا بہت سلیس اور عام فہم زبان میں ترجمہ کر دیا ہے' صوبہ سرحد کی حکومت نے تو اردو نافذ کر دی ہے۔ وہاں پر جو ایسٹا کوڈ ہے اس کا بھی مقتدرہ نے ترجمہ کر دیا ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اردو کو دفتروں

اور اداروں میں ایسے نافذ کر دیا جائے کہ جو لوگ اردو میں لکھنا پسند کریں' وہ اردو میں لکھیں اور جو اردو میں نہیں لکھ سکتے وہ انگریزی میں لکھیں اور جو ان دونوں زبانوں میں مکمل طور پر نہیں لکھ سکتے وہ ان دونوں زبانوں کو ملا جلا کر لکھیں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب اردو مکمل طور پر نافذ ہو جائے گی۔ آج وہ لوگ جن کے پاس بہت قیمتی خیالات ہیں' جو اچھی تجاویز دے سکتے ہیں لیکن اس لئے نہیں دے پاتے کہ وہ انگریزی میں نہیں لکھ سکتے اس اقدام کے بعد فائدہ یہ ہوگا کہ وہ اسے اردو میں لکھ سکیں گے۔ بات تو خیالات اور تجاویز کی ہوتی ہے کہ وہ کتنی صحت مند ہیں۔ اسی طرح مقابلے کے امتحانات میں بھی طلباء کے پاس اختیار ہونا چاہیے کہ وہ چاہیں تو اردو میں جواب دیں یا چاہیں تو انگلش میں جواب دیں۔ پھر ایک وقت ایسا آ جائے گا کہ وہ صرف اردو میں ہی لکھیں گے لیکن اس سب کے معنے یہ بھی نہیں ہونے چاہئیں کہ ہم انگریزی زبان کی افادیت کے منکر ہو جائیں۔ انگریزی ایک اہم بین الاقوامی زبان ہے اور اس سے روگردانی ہمارے لئے نقصان کا باعث ہوگی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھیں کہ اردو ہماری قومی شناخت ہے اور اس کو بھی بروئے عمل لایا جائے۔

س: بعض لوگ کہتے ہیں کہ دوہرا نظام تعلیم ختم ہونا چاہیے' آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: دوہرا نظام تعلیم یقیناً ختم ہونا چاہیے کیونکہ یہ بے حد نقصان دہ ہے' یہ نظام تعلیم ایک ہی ملک کے باشندوں کے درمیان طبقات پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے اور جب طبقات پیدا ہوتے ہیں تو ان کے درمیان کشمکش بھی پیدا ہوتی ہے۔ جو بچہ انگریزی میڈیم میں پڑھتا ہو اور دوسرا جو کہ اردو میڈیم میں پڑھتا ہے آج بھی ان دونوں کے درمیان ایک واضح فرق نظر آتا ہے کیونکہ اردو کو کمتر اور حقیر سمجھا جاتا ہے' کوئی زبان حقیر یا برتر نہیں ہوتی۔ زبان کسی معاشرے کی شناخت کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے کا بہترین ذریعہ اظہار اردو ہے۔ پاکستان کے نظام تعلیم کا قومی زبان میں آ جانا اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے بچے زبان سیکھنے میں کئی برس صرف کر دیتے ہیں بلکہ بعض لوگ تو عمر گزار دیتے ہیں لیکن غیر ملکی زبان نہیں سیکھ پاتے۔ اگر وہ پہلے دن سے ہی اپنی زبان میں تعلیم حاصل کریں تو وہ پہلے دن سے ہی ڈاکٹر' انجینئر' سائنسدان اور وکیل بن جائیں گے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا بچہ دس سال تک زبان سیکھتا رہتا ہے' اس کے بعد کہیں جا کر حصول علم کی منزل شروع ہوتی ہے۔

س: جہاں جہاں اردو زبان پہنچی ہے وہاں مشاعرے کی روایت بھی موجود ہے' ان مشاعروں کی وجہ سے بھی زبان کو فروغ ملتا ہے؟

ج: مشاعروں کی وجہ سے نہ صرف زبان کو فروغ ملتا ہے بلکہ اردو زبان کی ترقی میں مشاعروں نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ مشاعرے ہماری تہذیب و ثقافت کا ایک حصہ بن گئے تھے اور آج اردو عالمی سطح پر جو مقام و مرتبہ حاصل کر چکی ہے اس میں مشاعروں کو بڑی حد تک عمل دخل حاصل ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جہاں مشاعروں نے اردو کو مقبولیت بخشی وہاں ایک زمانے میں اردو فلمیں بھی بڑی اہمیت حاصل کر گئی تھیں۔ لوگ فلمیں دیکھ کر اردو سیکھتے تھے اور اس طرح وہ اردو کے قریب آتے گئے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ مشاعرہ جو کہ ہمارے ہاں ایک ادارے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا وہ اب مسلسل زوال پذیر ہے۔ اس کا سبب تخریب ایک تعمیر کو قرار دیا جاسکتا ہے اور وہ تعمیر ہے۔ ٹیلی ویژن جو کہ ایک نہایت مفید اور موثر ذریعہ ہے جس سے اصلاح اور تعلیم و تربیت کا کام بھی لیا جاسکتا ہے اور جس سے تخریب بھی کی جاسکتی ہے جو کی گئی ہے۔ ٹیلی ویژن کے وجود میں آنے کے بعد سے بڑے مشاعروں کی روایت ختم ہوگئی ہے۔ پہلے پاک و ہند کے شعراء اکٹھے ہوتے تھے بڑے بڑے مشاعرے ہوتے جو رات رات بھر چلتے تھے۔ اب ٹیلی ویژن کی سکرین پر چند شعراء کو مدعو کیا جاتا ہے یا سٹوڈیو میں جتنے سامعین کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی ہے صرف ان کو بلا لیا جاتا ہے۔ پاکستان میں تو اب مختصر نشستیں ہو جاتی ہیں، لیکن بڑا مشاعرہ سالہا سال سے نہیں ہوا۔ اگر ہوئے ہیں تو وہ بھی چند ایک ہی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہمارے جو اہل وطن بیرون ممالک میں آباد ہیں ان کا اپنی زبان سے لگاؤ بڑھ رہا ہے مثلاً برطانیہ میں اردو ادب سے لگاؤ دن بہ دن فروغ پا رہا ہے۔ ادبی محفلیں اور مشاعرے ہو رہے ہیں اور جن شعراء کو پاکستان میں رہ کر بڑے مشاعرے پڑھنے کا موقع نہیں مل رہا وہ امریکہ، کینیڈا جا رہے ہیں اور یہاں برطانیہ آ رہے ہیں۔ گلف کے مشاعرے بھی بہت شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ پاکستان میں مشاعرے زوال پذیر ہوئے ہیں لیکن پاکستان سے باہر مشاعرے آج بھی زندہ ہیں۔

س: آپ کا نظریہ تخلیق کیا ہے؟

ج: تخلیق کوئی ارادی عمل نہیں ہے یہ لہر انسان کے تحت الشعور سے اٹھتی ہے اور پھر وہ شعوری کیفیت اختیار کرتی ہے یہ کیفیت بہت سارے عوامل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جس میں داخلی محسوسات، تصورات اور جذبات شامل ہیں عقل بہ یک وقت بیرونی دنیا کا بھی احاطہ کرتی ہے جس میں عصر رواں کے حالات و واقعات شامل ہو جاتے ہیں اور ان دونوں کا امتزاج انسان کے وجدان میں ایک تخلیقی ہیجان پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں ادب وجود میں آتا ہے چاہے وہ نثری ادب ہو یا شعری ادب یا فنون لطیفہ کی دوسری اشکال میں ہو اس کے

پیچھے تخلیقی پسِ منظر یہی ہوتا ہے ادب اکتسابی بھی ہوتا ہے جو کہ اپنی جگہ حقیقت ہے جیسے شعر میں آمد اور آورد کا معاملہ آمد تو ایک غیر ارادی عمل ہے لیکن آورد ارادی عمل ہے جسے تربیت و نشوونما کی ضرورت ہے۔

س: پاکستان میں آج کل جو حالات ہیں اس کے بنیادی اسباب کیا ہیں اور پاکستان کے مستقبل کو آپ کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ج: میں اپنی فطرت کے اعتبار سے رجعت پسند واقع ہوا ہوں اور یہی درس ہمارے دین نے بھی دیا ہے کہ مایوسی کفر ہے اور مایوسی کی ہمیشہ مزاحمت کرنا چاہیے اگر آپ اپنی پوری ذہنی اور فکری صلاحیتوں سے مایوسی کی مزاحمت کریں گے تو مجھے یقین ہے کہ آپ اس مایوسی پر غالب آ جانے میں کامیاب ہو جائیں گے' پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے جسے بڑی قربانیوں کے نتیجے میں حاصل کیا گیا ہے پہلے دن جس نظریئے کے نتیجے میں یہ ملک وجود میں آیا آج بھی وہ نظریہ لوگوں کے دلوں کی دھڑکن ہے ہر وہ کوشش جو پاکستان کو اس نظریئے سے ہٹانے کے لئے کی جائے گی پاکستان کے عوام اسے کبھی قبول نہیں کریں گے' دوسرا سوال پاکستان میں استحکام کا ہے وہ استحکام' سیاسی' معاشی اور تہذیبی و معاشرتی بھی ہوسکتا ہے' ان شعبوں میں عدم استحکام کی جن کیفیات کا ہم نے مشاہدہ اور تجربہ کیا ہے ان کے پس منظر میں ہمیں ایک ہی فیکٹر کار فرما نظر آتا ہے' کبھی لوگ کہتے ہیں کہ سیاسی بحران ہے' کبھی معاشی اور آئینی بحران کی بات کی جاتی ہے' میرے خیال میں اس سب کا پس منظر اور بنیادی وجہ کردار کا بحران ہے' کردار کے بحران نے تقریباً ہر شعبے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے' دیانت وصداقت کا بحران بھی کردار کا بحران ہی کہلاتا ہے' جب تک دیانت اور صداقت نہیں آئے گی تو معیشت و معاشرت میں بھی دیانت وصداقت نہیں رہے گی' اس سب کیلئے ایک اچھے نظام تعلیم کی ضرورت ہوسکتی ہے اس وقت بنیادی ضرورت یہ ہے کہ پاکستان کا نظام تعلیم نظریہ پاکستان اور اسلام کے حوالے سے مرتب کیا جائے تاکہ اخلاقی قدروں کو استحکام حاصل ہو میں مایوس نہیں ہوں اور انشاءاللہ یہ اچھا کردار ایک دن پاکستان میں ضرور پیدا ہوگا۔

ثمین صدیقی

سفر حج کی روح پرور داستان

آفرین صدیقی ایک مایہ ناز ایرو سپیس انجینئر (AERO SPACE ENGINEER) ہیں جنہیں اپنی قابلیت کے پیش نظر مختلف ملکی اور غیر ملکی ایوارڈ ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس وقت وہ امریکہ کی معروف یونیورسٹی MIT سے Ph.D کر رہی ہیں۔

۲۰۰۲ء میں انہوں نے حج کا فریضہ ادا کیا۔ اس فریضے کی تیاری' دورانِ سفر ابھرتے ہوئے جوش و جذبات' حرم میں حاصل ہونے والے روحانی فیوض' عرفات میں اللہ کے حضور طاری ہونے والی رقت اور حج کے اختتام پر اس روحانی تجربے اور منظر سے جدائی کو انہوں نے اپنی کتاب "The Sinless Sea" میں بہت خوبصورتی سے قلمبند کیا ہے۔ مصنفہ کے لکھنے کے دلکش اسلوب' ترتیب' توجہ' جزوی تفصیل' محاکاتی انداز بیان اور اپنے دل میں بسا کر اپنے جذبات و احساسات کے اظہار سے اس کتاب کو بے حد دلچسپ بنا دیا ہے۔ تحریر کی سادگی و سلاست قارئین کو اپنے احاطے میں لے لیتی ہے۔ ان کے تذکرے کہیں تو اشکباری پر مجبور کر دیتے ہیں اور کہیں مسکرانے پر۔

مصنفہ کے انداز بیان کی روانی قارئین کی توجہ پہلے صفحے میں کھینچ کر آخری صفحے تک اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ اگرچہ انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ "The sinless Sea" مناسکِ حج کی کتاب نہیں بلکہ ان کے ذاتی جذبات کا اظہار ہے لیکن اس کے باوجود یہ کتاب پڑھنے والوں کے دامنِ دل کو اس طرح کھینچ لیتی ہے کہ قارئین کے دلوں میں حج کی خواہش خود بخود تڑپ اٹھتی ہے۔

اس کتاب کا اختتام بھی حد درجہ دلکش ہے۔ آفرین اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں:۔
''مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے مکہ کی فضا میں سانس لی۔ میری زبان نے زم زم کو چکھا۔ میرے کانوں میں ''لبیک'' کی صدا گونجی۔ میری آنکھوں نے مسلمانوں کا سب سے بڑا مجمع دیکھا۔ میرے دل اور روح نے اللہ کے بلاوے اور اپنی حاضری کا شکر ادا کیا۔ میں نے اپنے آقا کی مقدس مسجد میں رکوع و سجود کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ میری زندگی کا ناقابل فراموش سفر ہے جس کا اور کسی سفر کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا''۔

کتاب کی قیمت جو ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے صرف ۱۰۰ روپیہ ہے اور درج ذیل پتہ سے منگوائی جا سکتی ہے:
مکان نمبر ۲۲ سٹریٹ نمبر ۴۳' سیکٹر جی ۸/۲' اسلام آباد

شہلا احمد

سملو۔۔ جادوئی اثر رکھنے والی ایک جڑی بوٹی

سملو نباتات کے خاندان زرشکیہ (Berberideae) سے تعلق رکھتی ہے جس کو لاطینی زبان میں Berebris aristata کہتے ہیں۔اس کا پودا قدِ آدم اور کانٹے دار ہوتا ہے۔اس میں پھل لگتا ہے۔اس کی جڑ زرد جبکہ کچھ علاقوں میں سیاہ رنگ کی ہوتی ہے۔ پاکستان میں یہ بوٹی ایبٹ آباد' شمالی علاقہ جات' سوات اور شاہراہ ریشم پر پائی جاتی ہے۔اس بوٹی کی جڑ کا چھلکا دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔اب تک اس کو بے شمار امراض میں آزمایا جا چکا ہے۔جس کے نتائج نہایت حوصلہ افزاء اور متاثر کن رہے ہیں۔

حکیم عبدالوحید سلیمانی صاحب کو اس طلسماتی جڑی بوٹی کے فوائد کے بارے میں ان کی بھتیجی کے ذریعے پتہ چلا۔جن کے پڑوس میں ایک صاحبہ کو چھاتی کا کینسر تھا۔اس بوٹی کے استعمال کے بعد ان کی یہ بیماری ایک ماہ کے اندر اس طرح جاتی رہی جیسے کبھی تھی ہی نہیں اور یہ بوٹی ان پڑوسن صاحبہ کو ایک فقیر بابا نے لا کر دی تھی اور ساتھ ہی اس کا طریقہ استعمال بھی سمجھا گئے تھے۔۔۔!! چنانچہ اس پر مزید ریسرچ اور تجربات کئے گئے جس سے ثابت ہوا کہ یہ بوٹی متعدد قسم کے سرطان مثلاً ہڈیوں' جگر اور خون کے سرطان کیلئے بھی اتنی ہی کارآمد اور زود اثر ہے۔ ہر قسم کے سرطان میں اس کو دو طریقوں سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔اولاً اس کی جڑ کے چھلکے تین ماشہ لے کر ایک پیالی پانی میں صبح بھگو دیں اور شام کو کھانے کے آدھے گھنٹہ بعد پی لیں۔اسی طرح رات کو تین ماشہ ایک پیالی پانی میں بھگو دیں اور صبح پی لیں۔دوسرا طریقہ یہ ہے کہ چونکہ یہ بہت کڑوی ہوتی ہے' اسے پیس کر باریک سفوس بنالیں اور ڈبل زیرو کے کیپسول میں بھر لیں۔اور ایک کیپسول صبح اور ایک شام کھانے کے بعد استعمال کر لیں۔انشاءاللہ جلد ہی مرض جاتا رہے گا۔

سرطان کے علاوہ ایسا بخار جو کسی دوا سے بھی نہ جاتا ہو اس میں بھی یہ بوٹی بڑی موثر ہے۔اس کا سفوف ایک ایک ماشہ صبح' دوپہر اور شام دودھ کے ساتھ لینے سے بخار جاتا رہے گا۔اگر اعصابی درد کی صورت ہو تو سملو کے ساتھ کچلہ مدبر ملا کر صبح شام ایک ایک ماشہ استعمال کرنے سے فائدہ ہوگا۔اگر گلے میں گلٹیاں (ٹانسلز) ہوں' سملو کی لکڑی کا چھوٹا سا ٹکڑا رات کو سوتے وقت منہ میں رکھنے سے ٹانسلز دور ہو جائیں گے۔

کتاب النباتات کے مصنف جناب حکیم منیر احمد قریشی نے ذیابیطس کے مریض پر اس بوٹی کا استعمال کیا تو نتیجہ نہایت حوصلہ افزاء تھا۔ ثابت ہوا کہ ذیابیطس کے مریض کو تین تین ماشہ سملو کی جڑ کا چھلکا ایک پیالی پانی میں بھگو کر صبح شام دینے سے ایک ہفتے کے اندر اندر مرض جاتا رہتا ہے۔

ہڈی وغیرہ ٹوٹ جانے کی صورت میں بھی سملو کا استعمال جادوئی اثر دکھاتا ہے۔ یہ تجربہ جناب حاجی مشتاق شرق پور والے نے ایک بیس سالہ لڑکے پر کیا جس کے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور ڈاکٹروں نے اس کی ٹانگ کاٹنے کو کہا تھا۔ گاؤں والے حاجی صاحب کے پاس اس لڑکے کو لے آئے۔ انہوں نے سملو تین تین ماشہ ایک پیالی پانی میں ملا کر صبح شام اس لڑکے کو پلانے کو کہا -- بیس دن بعد ماشاء اللہ وہ لڑکا اپنی ٹانگوں پر چلنے کے قابل ہو گیا۔ ہڈی وغیرہ ٹوٹنے کی صورت میں سملو کی جڑ کے چھلکوں کو باریک پیس کر انڈے کی سفیدی میں ملا کر متاثرہ جگہ کی پٹی کرنے سے بھی ہڈی جڑ جاتی ہے۔ چوٹ لگ جائے تو چائے یا دودھ کے ساتھ سملو کا سفوف کھانے سے درد کو آرام آ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پھوڑے پھنسیوں پر اس کا لیپ فائدہ مند ہوتا ہے۔ آنکھ دکھنے آ جائے تو اس کی لکڑی کو گھس کر آنکھ کے اردگرد لگانے سے درد کو آرام آتا ہے۔

ابورویدگ نے اپنی کتاب شادنگدھر میں جو طب کے موضوع پر ایک معروف دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے سملو کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ یرقان (ہیپاٹائٹس) میں سملو کے جوشاندے کو شہد میں ملا کر پلانا مفید ہے۔ جبکہ جناب مظفر حسین اعوان کتاب المفردات میں تحریر کرتے ہیں کہ سملو کی جڑ کی چھال کا جوشاندہ تلی اور جگر بڑھ جانے کی صورت میں بے حد مفید ہے۔ ''خزائن الادویہ'' طب کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس کے مصنف جناب انجم الغنی فرماتے ہیں کہ سملو مثانے کی پتھری کو توڑتی ہے۔ اگر اسے براؤن شکر کے ساتھ کھایا جائے تو پتھری بننے کے آئندہ عمل کو روکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس جڑی بوٹی کا استعمال پیٹ کے کیڑے نکالتا ہے اور ورم دور کرتا ہے۔ اس کی ٹہنیوں کو ابال کر پلانے سے پسینہ اور اسہال کے ذریعے جوڑوں کا درد دور ہوتا ہے۔ اسہال کی صورت میں اس کی جڑ، چھال اور سونٹھ ہم وزن لے کر پیس کر سفوف بنالیں۔ اور دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ اسہال بند ہو جائیں گے۔ آج کے مہنگائی کے دور میں یہ طریقۂ علاج اتنا مفید اور سستا ہے کہ غریب سے غریب مریض بھی اس کا متحمل ہو سکتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس جڑی بوٹی پر زیادہ تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب طب کی دنیا اس بوٹی کے طلسماتی اثر کے حوالے سے مزید اسرار و رموز پر سے پردہ اٹھا سکے گی اور ایک عالم اس سے مستفید ہو رہا ہو گا......! (بشکریہ جناب حکیم عبدالوحید سلیمانی)

بیگم طیبہ آفتاب

گھریلو چٹکلے

☆ چہرے کی جھرّیاں دور کرنے کیلئے

دس تولہ شہد میں ایک تولہ کیلے کے تنے کا رس ملا کر چہرے پر لیپ کریں۔ پندرہ سے بیس منٹ بعد چہرہ دھولیں۔ جھریاں جاتی رہیں گی۔

☆ خسرہ سے بچاؤ کیلئے

ایک دانہ منقہ کالے کر اس کا بیج نکال دیں اور اس میں ایک چٹکی خاکسیر رکھ کر بچوں کو کھلائیں خسرہ نہیں نکلے گا۔

☆ نارمل جلد کو چمکدار بنانے کیلئے

پیاز کے رس کو چہرے پر آہستہ آہستہ ملیں جلد نکھری نکھری اور چمکدار ہو جائے گی۔ لیکن خیال رہے کہ رس آنکھوں میں نہ لگنے پائے۔۔۔ ورنہ۔۔۔ آپ جانتے ہی ہیں۔ کیا ہوگا۔۔۔!

☆ آم کی کیری سے لُو کا علاج

اگر خدانخواستہ لُو لگ جائے تو آم کی کیری کی چھاچھ پینے سے افاقہ ہو جاتا ہے۔ خصوصاً حلق اور زبان خشک ہونے اور پسینہ آنے کی صورت میں کیری کی چھاچھ بے انتہا فائدہ کرتی ہے۔

چھاچھ تیار کرنے کا طریقہ: ایک بڑی سی کیری لے کر اسے چولہے پر سینک کر یا ابال کر نرم کرلیں اور کچھ دیر کیلئے ٹھنڈے پانی میں رکھ دیں۔ اس کے بعد چھلکا اتار کر اس میں سیاہ مرچ' دھنیا' سفید زیرہ' نمک اور اچھی طرح پھنٹا ہوا دہی ملا کر مکس کرلیں۔ ضرورت ہو تو تھوڑا سا پانی بھی ملالیں۔

☆ چقندر سے بڑھی تلّی کا علاج

تلّی بڑھ جائے تو چقندر کا پانی شہد میں ملا کر پئیں۔ جگر کے افعال میں پیدا شدہ رکاوٹیں دور ہو

جائیں گی اور بڑھی ہوئی تلی کم ہو جائے گی۔اس کے علاوہ یرقان کے علاج کیلئے بھی چقندر کا استعمال بہترین ہوتا ہے۔

☆ سردی میں ہاتھ پاؤں پھٹنے کی صورت میں

چقندر کے پتے ابال کر جوشاندہ سا تیار کر لیں اور خشک اور پھٹی ہوئی جلد کو اس سے بار بار دھوئیں۔ جلد صحیح ہو جائے گی۔۔اس کے علاوہ یہ جوشاندہ بالوں کے نرم اور گھنا کرنے میں بھی بڑا مفید ثابت ہوتا ہے۔

☆ پھلوں کو تازہ رکھنے کیلئے

پھلوں کو تازہ رکھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ انہیں فرج میں رکھنے سے پہلے ان پر لیموں کا عرق چھڑک دیں۔

☆ نوڈلز کو چپکنے سے بچانے کیلئے

اکثر خواتین شکایت کرتی ہیں کہ ان کی نوڈلز پکنے کے بعد آپس میں جڑ جاتی ہیں۔تو اس سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ نوڈلز ابالتے وقت پانی میں تھوڑا سا کوکنگ آئل ڈال دیں۔اور جب ابالنے کے بعد چھلنی میں پانی نتھاریں تو ان پر ٹھنڈا پانی بہائیں۔نوڈلز بالکل بھی نہیں جڑیں گی۔

☆ دانت کے درد کیلئے

دانت میں درد کی صورت میں تلسی کے تین چار پتے لے کر ہلکا ہلکا کچل لیں کہ ان کا عرق سا نکل آئے اور پھر اس میں ایک دانہ کالی مرچ کا کوٹ کر ملا لیں اور اس کو درد والے دانت کے درمیان رکھ لیں۔منہ میں پانی آنے پر اسے تھوکتے رہیں۔انشاءاللہ درد جاتا رہے گا۔

☆ کھانے پینے کی اشیاء سے چیونٹیاں دور رکھنے کیلئے

اگر آپ چاہتے ہیں کہ خصوصاً گرمیوں کے موسم میں آپ کی کھانے پینے کی اشیاء چیونٹیوں کی یلغار سے محفوظ رہیں تو اس کے لئے آپ کو ایک چھوٹا سا کام کرنا پڑے گا اور وہ یہ کہ جب بھی کوئی چیز خواہ وہ چینی ہو، گوشت ہو، مٹھائی ہو یا کوئی اور شے، کہیں رکھیں تو اپنا سانس روک لیں اور اسے مطلوبہ جگہ پر رکھ دیں۔چیونٹیاں کبھی بھی اس کے اندر نہیں آئیں گی۔۔اور یہ عمل آپ کو ہر بار چیز اٹھا کر واپس رکھنے پر بھی کرنا پڑے گا۔
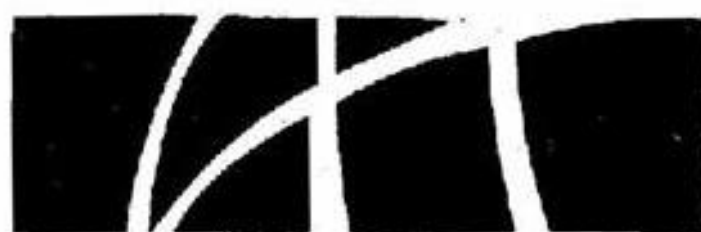
Drilling tough fathoms to explore the hidden treasures. OGDCL today has the largest exploration and production portfolio in the Oil and Gas Sector.

With this powerful track record of landmark discoveries and a succes ratio of 1:3, OGDCL undertakes aggressive exploration and development programmes to scale new heights in the energy sector of Pakistan.

Oil & Gas Development
Company Ltd.

ORIENT McCANN

DRAMA

COMEDY

Mondays to Saturdays on STN / Channel 3
from 6 pm to 1:30 am

PRIME Pooray ghar kee jan